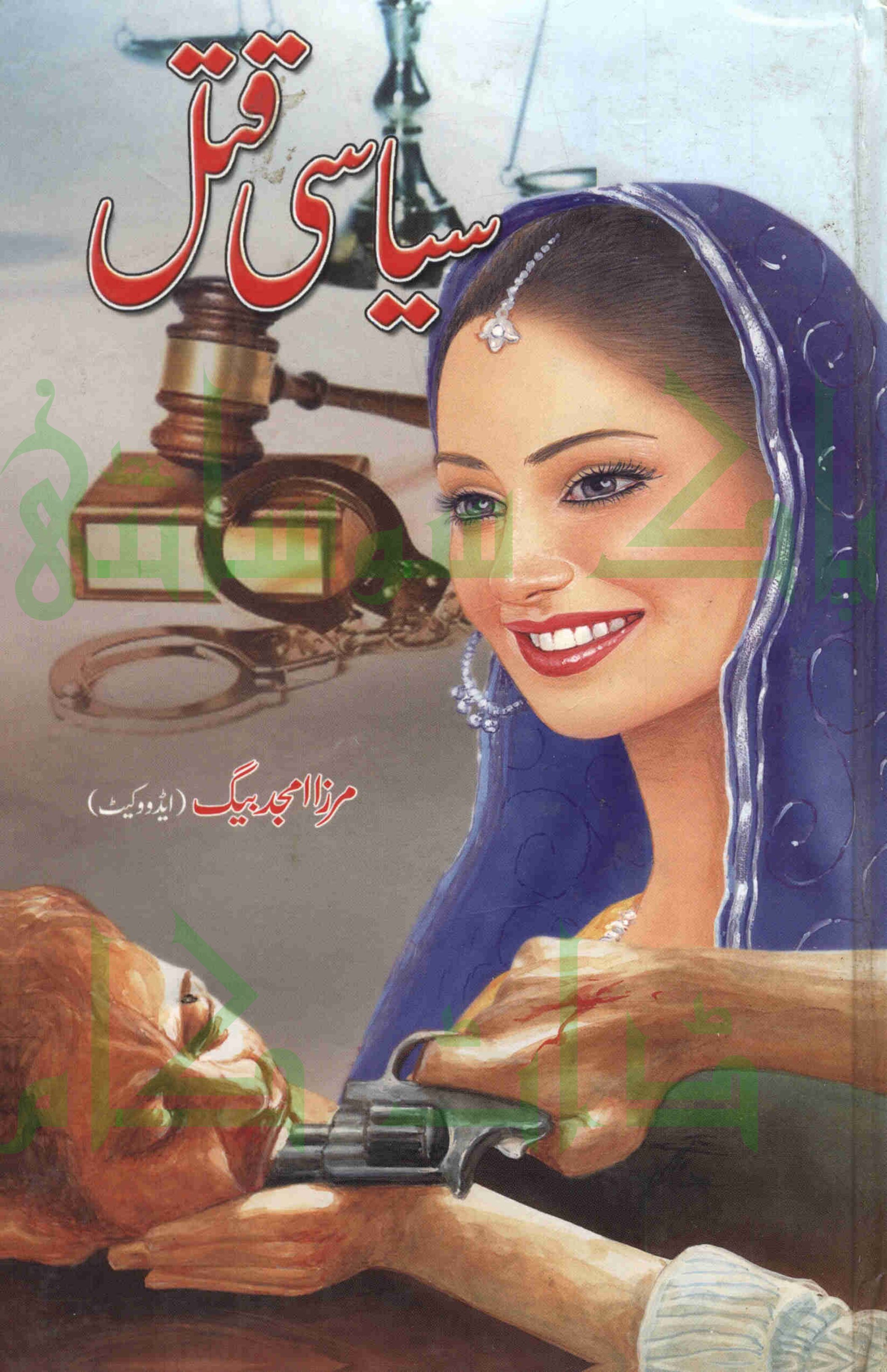

سیاسی قتل
مرزا امجد بیگ (ایڈووکیٹ)

ٹوٹی کمند

بعض سوالات بڑے آزمائشی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ وہ اچانک اس طرح سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں کہ ان کے جواب میں سچ بولتے ہوئے، انسان تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ ڈر محسوس ہوتا ہے کہ کہیں خوامخواہ شرمندگی نہ اٹھانا پڑ جائے۔ وہ بھی کچھ اسی قسم کا سوال تھا!

سوال کرنے والے کا نام شکیل خان تھا۔ عمر لگ بھگ پینتیس سال رہی ہو گی۔ قد درمیانہ اور جسم مضبوط، رنگت گوری اور سر کے بال سولجر کٹ۔ اس نے متناسب سائز کی گھنی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔

وہ ایک کلائنٹ کی حیثیت سے میرے آفس میں آیا تھا۔ میں نے حسب معمول پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا تھا۔ جب وہ میرے روبرو ایک نشست سنبھال کر بیٹھ گیا اور میں نے رسمی علیک سلیک کا مرحلہ بھی طے کر لیا تو اس نے قدرے تلخ انداز میں مجھ سے پوچھا تھا۔

"وکیل صاحب! کیا اس ملک میں انسانوں کو جینے کا کوئی حق نہیں؟"

میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کا بہ غور جائزہ لیا اور کہا۔

"کیوں نہیں جناب! اس ملک میں انسان کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں، جن میں سے ایک انسان آپ ہیں اور ایک میں ہوں۔"

میں نے لمحاتی توقف کیا، پھر اس سے پوچھا۔

"شکیل صاحب! آخر معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ بڑا گمبھیر ہے وکیل صاحب!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "آپ کا نام غالباً...مرزا صاحب.....!"

"مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ۔" میں نے اس کے ادھورے سوالیہ جملے کے جواب میں کہا۔

"امجد بیگ صاحب!" اس نے تینوں الفاظ پر علیحدہ علیحدہ زور ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے آپ کی قانونی مدد اور رہنمائی چاہئے۔"

میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھالتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "جی شکیل صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"میرے چھوٹے بھائی خلیل خان کو پولیس نے قتل کے جھوٹے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔" اس نے دکھی لہجے میں بتایا۔ "اس کے علاوہ خلیل پر لوٹ مار کا الزام بھی ہے۔"

"اوہ......!" میں نے ہونٹ سکیڑ کر متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "مقتول کون ہے؟ اور یہ وقوعہ کب اور کہاں پیش آیا ہے؟"

"مقتول کا نام سیٹھ منظور معلوم ہوا ہے۔" شکیل نے جواب دیا۔ "مقتول سیٹھ پاپوش کے علاقے میں ایک ہوٹل کا مالک تھا۔ وہ رات کو ہوٹل بند کر کے موٹر سائیکل پر اپنے گھر واقع نیو کراچی جا رہا تھا کہ کسی راہزن نے اسے لوٹ کر قتل کر ڈالا۔ پولیس کے خیال میں وہ راہزن قاتل میرا چھوٹا بھائی خلیل خان تھا۔ چنانچہ پولیس نے میرے بھائی کو گرفتار کر کے لاک اپ میں ڈال دیا اور جہاں تک وقوعہ کا تعلق ہے......" وہ سانس ہموار کرنے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ واقعہ نو اور دس فروری کی درمیانی رات کا ہے۔ وقوعہ کا مقام سیٹھ منظور کے ہوٹل کے قریب ہی ہے۔ وہ ہوٹل سے نکل کر مین روڈ پر چڑھا ہی تھا کہ یہ واقعہ پیش آگیا۔"

میں نے فوراً تاریخوں کا حساب لگایا اور کہا۔

"آج گیارہ فروری کی شام ہے اور وقوعہ نو فروری کی رات کو پیش آیا۔ اس کا

مطلب ہے، اگلے روز یعنی دس فروری کو پولیس نے ملزم کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا؟"

"جی ہاں........آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "خلیل اس وقت عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔"

میں نے پوچھا۔

"مقتول سے جو رقم لوٹی گئی، اس کا تخمینہ کیا بتایا جاتا ہے؟"

"پانچ ہزار روپے یا کچھ زیادہ؟" شکیل خان نے جواب دیا۔

میں نے استفسار کیا۔

"آپ کی رہائش کراچی کے کس علاقے میں واقع ہے؟"

"ہم لوگ چاندنی چوک میں رہتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"پاپوش نگر........!" میں نے زیر لب دہرایا۔ "پاپوش اور چاندنی چوک دونوں ناظم آباد کے علاقے ہیں اور ان میں زیادہ فاصلہ بھی نہیں۔ یہ دونوں مقام ایک ہی تھانے کی حدود میں آتے ہیں۔" میں نے پُرسوچ انداز میں تھوڑا توقف کیا، پھر پیڈ پر قلم گھسنے کے بعد پوچھا۔

"پولیس نے آپ کے بھائی کو کس بنا پر سیٹھ منظور کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے؟"

"ارشاد علی کے بیان اور نشاندہی پر۔" اس نے نفرت بھرے انداز میں بتایا۔

"یہ ارشاد علی کون ہے؟" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

اس نے بتایا۔

"ارشاد علی، مقتول کے ہوٹل میں باورچی کا کام کرتا ہے۔ مختلف قسم کے سالن وغیرہ بنانا اس کے فرائض میں شامل ہے۔ ارشاد کا گھر ناگن چورنگی کے قریب ہے اور وہ رات کو ہوٹل بند ہو جانے کے بعد مقتول کے ساتھ ہی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گھر جاتا تھا۔ مقتول سیٹھ اسے ناگن چورنگی پر ڈراپ کر کے اپنے گھر کی طرف نکل جاتا تھا۔ میری معلومات اسی حد تک ہیں، بیگ صاحب!"

"اس کا مطلب ہے، جب قتل کا یہ واقعہ پیش آیا، ارشاد علی مقتول کے ساتھ موجود

تھا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اس نے اپنی آنکھوں سے آپ کے بھائی کو لوٹ مار اور ڈکیتی وقتل وغیرہ کی یہ واردات کرتے دیکھا تھا۔ گویا وہ اس کیس میں عینی شاہد کی حیثیت کا حامل ہے؟''

''نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' شکیل خان نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے میرے خیال کی تردید کر دی اور بولا۔ ''ارشاد کے مطابق حملہ آور نے اپنے چہرے کو ایک ڈھاٹے میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے قد کاٹھ اور جسامت کی بنا پر یہ اندازہ قائم کیا کہ وہ میرا بھائی خلیل تھا۔ اس نے پولیس کو یہ بھی بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز ہی شام کے وقت ملزم اور مقتول میں اچھی خاصی تلخ کلامی بھی ہوئی تھی۔''

''تلخ کلامی ہوئی تھی؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''یہ تلخ کلامی مقتول کے ہوٹل میں ہوئی تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا۔

''دراصل، خلیل کے کالج کا ایک دوست ندیم ادھر بورڈ آفس کے قریب ہی رہتا ہے۔ ندیم جب بھی اس سے ملنے آتا ہے تو وہ لوگ چائے وغیرہ پینے کے لئے مقتول کے ہوٹل میں بیٹھ جاتے ہیں۔ وقوعہ کی شام بھی ایسا ہی ہوا تھا۔''

وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''بس، اس شام ان کے سالن میں کوئی مکھی نکل آئی تھی، جس کے باعث خلیل اور ندیم کی مقتول کے ساتھ اچھی خاصی جھڑپ ہو گئی، جس میں خلیل نے بڑھ چڑھ کر ''حصہ'' لیا چنانچہ اس ناخوشگوار واقعے کو بنیاد بنا کر مقتول کے باورچی ارشاد علی کے بیان کو سچ مان لیا گیا اور پولیس نے......''

''پولیس کے، اس نوعیت کے کارناموں کے باعث لوگوں کے دلوں اور نظروں میں اس کا مقام بری طرح گر چکا ہے۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''اکثر لوگ پولیس کے اس رویّے کی شکایت کرتے ہیں۔ اپنے کام کی آسانی کے لئے وہ کچھ بھی کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اور بسا اوقات کوئی بے گناہ، کسی ناکردہ جرم کی ''پاداش'' میں ان کے چنگل میں جا پھنستا ہے اور کبھی کوئی خطرناک مجرم آسانی سے بچ نکلتا ہے۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے، بیگ صاحب!'' اس مرتبہ شکیل خان نے میری بات قطع کی اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''لیکن مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے کہ پولیس والوں نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت میرے بھائی کو اس کیس میں ملوث کیا ہے۔ انہیں میرا رویّہ پسند آیا تھا اور نہ ہی میرا لہجہ گوارا ہوا تھا۔ ان کے تیوروں سے میں نے اسی وقت یہ بھانپ لیا تھا کہ موقع ملتے ہی وہ مجھ پر کوئی کام ضرور لگائیں گے۔ میں تو ان کے ہاتھ نہیں آیا، البتہ انہوں نے میرے چھوٹے بھائی کو قتل اور لوٹ مار کے جھوٹے الزام میں پھنسا دیا ہے...... یہ خلیل کی بدقسمتی ہے کہ وقوعہ کی شام اس کا مقتول سے جھگڑا ہو گیا تھا لہٰذا ارشاد کی نشاندہی پر شک کے سارے تیر خلیل کی سمت چل گئے۔''

وہ لمحے بھر کو تھما، ایک بوجھل سانس خارج کی اور مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔

''میں تو سمجھ رہا تھا، اب تک یہ ملک انسانوں کے لئے محفوظ پناہ گاہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہو گا۔ لیکن ایک ماہ کے تجربے اور مشاہدے نے مجھے سخت مایوس کیا ہے۔ اور پھر یہ خلیل کی گرفتاری کا تازہ ترین واقعہ...... پتہ نہیں، ہمارا ملک کس سمت جا رہا ہے!''

شکیل خان کے طویل طنزیہ اور جذباتی بیان میں پے در پے انکشافات بھرے ہوئے تھے لیکن میں نے اسے بیچ میں ٹوکنا مناسب نہ سمجھا اور بات پوری کرنے دی۔

چند لمحات کے بعد جب وہ خاموش ہوا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شکیل صاحب! آپ کی باتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی رہائش پاکستان سے کہیں باہر ہے، جو آپ اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔''

''جی ہاں۔ میں گزشتہ دس سال سے ''کے ایس اے'' میں رہ رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مگر میرے بیوی بچے ادھر پاکستان ہی میں ہیں۔ میں دو سال میں ایک چکر ادھر کا لگاتا ہوں اور مہینہ، ڈیڑھ مہینہ رہ کر واپس چلا جاتا ہوں...... ہر مرتبہ اس امید کے ساتھ کہ اگلی بار جب میں یہاں آؤں گا تو بہت کچھ بدلا ہوا ملے گا۔ اور یہ بدلاؤ مثبت ہو گا۔ لیکن افسوس کہ......''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتی بے بسی اور ہونٹوں

پر بھی تلخی نے مجھ پر واضح کر دیا کہ اگر وہ جملہ ادھورا نہ چھوڑتا تو اس کی زبان سے کس قسم کے الفاظ خارج ہوتے۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پُرسوچ انداز میں کہا۔

''کے۔ایس۔اے...... یعنی کنگ ڈم آف سعودی عریبیہ۔ آپ سعودی عرب میں کس جگہ ہوتے ہیں؟ اور آپ وہاں کیا کرتے ہیں شکیل صاحب؟''

''جناب! میں ریاض میں، ایک شیخ کی رہائش گاہ پر کام کرتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں بجلی سے متعلق ہر کام کا ماہر ہوں...... شیخ حامد بن ارشد نے مجھے اپنے محل میں کُل وقتی ملازم رکھا ہوا ہے۔ اس کے محل میں ہر الیکٹریکل پرابلم کو میں ہی ٹھیک کرتا ہوں۔''

''شیخ حامد بن ارشاد آپ کو خاصی مناسب تنخواہ دیتا ہوگا؟'' میں نے پوچھ لیا۔

''جی بیگ صاحب!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''شیخ صاحب کو ان کے حلقے میں ''پے ماسٹر'' کہا جاتا ہے۔ میں ان کی ملازمت میں بہت خوش ہوں۔''

''شکیل خان صاحب!'' میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تھوڑی دیر پہلے بڑے جذباتی انداز میں چند حیرت انگیز انکشافات کئے ہیں، جن کی روشنی میں پولیس نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت آپ کے بجائے چھوٹے بھائی خلیل خان کو اس جھوٹے کیس میں اُلجھایا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کا کون سا رویّہ پولیس کو پسند نہیں آیا تھا۔ اس کی تفصیل جاننا میرے لئے بہت ضروری ہے۔''

''آپ سنیں گے تو ہنسیں گے بیگ صاحب!'' وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔ ''چند روز پہلے ایک ایسا واقعہ پیش آیا ہے کہ میں جب بھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں، پولیس والوں کے لئے میرا دل و دماغ شدید نفرت سے بھر جاتا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں آپ کی بات سن کر بالکل نہیں ہنسوں گا۔ اگر اس واقعے کا آپ کے بھائی کی گرفتاری سے کوئی تعلق بنتا ہے تو یہ میرے علم میں لایا جانا بہت ضروری ہے۔''

''میں نے کہا نا، مجھے سو ایک فیصد یقین ہے۔'' وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔ ''خلیل کی گرفتاری اور اس پر لوٹ مار و قتل کا الزام اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ آپ سنیں گے تو آپ کو بھی ڈانڈے ملتے ہوئے دکھائی دیں گے۔''

''میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ بیان کریں۔''

چند لمحات تک وہ اس انداز میں خاموش بیٹھا رہا جیسے اپنے ذہن میں بکھرے ہوئے مختلف خیالات کو مجتمع کر رہا ہو، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے بتانا شروع کیا۔

''بیگ صاحب! مجھے سعودیہ سے آئے ہوئے دو تین روز ہی ہوئے تھے کہ ایک رات ہمارے گھر میں ڈاکو گھس آئے۔ وہ کُل دو افراد تھے اور انہوں نے ڈھاٹوں کی مدد سے اپنے چہروں کو اچھی طرح چھپا رکھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ان ڈاکوؤں کو کسی طرح یہ اطلاع ملی ہوگی کہ میں سعودیہ سے تازہ تازہ آیا ہوں۔ ہمارے ہاں ایک تصور بہت عام ہے کہ جو بھی شخص بیرونِ ملک کمانے جاتا ہے اور جب وہ واپس آتا ہے تو نقدی کے علاوہ اپنے ساتھ ڈھیروں قیمتی سامان بھی لے کر آتا ہے۔ لہٰذا لٹیروں اور ڈاکوؤں کے دل و دماغ میں بدنیتی کی کھجلی شروع ہو جاتی ہے اور وہ کسی واردات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔''

''ہاں، ایسا تو ہے۔'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''اور...... یہ تصور کچھ زیادہ غلط بھی نہیں۔ بیرونِ ملک سے آنے والے خاصے لدے پھندے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جرائم پیشہ افراد کو تحریک ملتی ہے۔''

یہ آج سے تیس پینتیس سال پہلے کا واقعہ ہے، لیکن آج کل تو جرائم کی نوعیت کے ساتھ ساتھ طریقۂ واردات میں بھی بڑی تبدیلی آئی ہے۔ اب ڈاکوؤں اور لٹیروں کا انداز خاصا ماڈرن اور انسٹنٹ ہو گیا ہے۔ وہ بیرونِ ملک سے آنے والے بیش قیمت ساز و سامان کے گھر پہنچنے کا انتظار نہیں کرتے، بلکہ ایئرپورٹ اور گھر کے درمیان کسی ''محفوظ'' مقام پر مال کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ اکثر ڈاکوؤں نے ٹیکسی ڈرائیوروں اور ان کے معاون ساتھیوں کا روپ دھار لیا ہے۔ اگر آپ کسی محفوظ اور قابلِ بھروسہ ریڈیو کیب میں سوار نہیں ہوتے تو ڈاکو ٹیکسی ڈرائیور آپ کو کسی بھی بہانے کسی ایسی سڑک پر لے جائے گا، جو ویران یا کم مصروف ہو تا کہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو اپنا ''کام'' کرنے میں آسانی رہے۔ یہ طریقۂ واردات بیرونِ ملک سے آنے والے ان لدے پھندے مسافروں پر زیادہ آزمایا جاتا ہے جن کی پروازیں رات کے درمیانی یا آخری حصے میں پاکستان پہنچتی ہیں۔

شکیل خان بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میرے گھر میں دو ڈاکو گھس آئے تھے لیکن میری برمحل ذہانت نے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔"

"آپ نے ان پر کوئی گن تان دی ہو گی!"

"آپ کا اندازہ کسی حد تک درست ہے۔" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں نے ان پر گن ضرور تان لی تھی، مگر وہ ڈاکو اس گن کی حقیقت سے واقف نہیں تھے اس لئے خوف زدہ ہو کر فرار ہو گئے۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ کوئی کھلونا گن تھی؟" میں نے اُلجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

"جی ہاں........ میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ قصہ دراصل یہ ہے کہ........" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

"بیگ صاحب! میں دو بچوں کا باپ ہوں۔ میرا بڑا بیٹا ضیغم دس سال کا ہے۔ اس سے چھوٹی بیٹی ہے جس کا نام زرناب اور عمر تقریباً سات سال ہے۔ میں ڈیڑھ، دو سال کے بعد جب بھی پاکستان آتا ہوں تو ان کے لئے کھلونے ضرور لاتا ہوں۔ زرناب کو گڑیاں اور بیوٹی پارلر کا سیٹ بہت پسند ہے اور وہ ہمیشہ اسی کی فرمائش کرتی ہے۔ جبکہ ضیغم کی پسند وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

اس مرتبہ اس نے فرمائش کی کہ میں اس کے لئے ایک کھلونا گن لے کر آؤں۔ مجھے ٹوائز مارکیٹ میں اس کی مطلوبہ گن نظر آ گئی اور میں اس کے لئے خرید لایا۔ اگر دور سے دیکھا جائے تو وہ گن بالکل اصلی نظر آتی ہے۔ جس رات ڈاکوؤں نے ہمارے گھر میں قدم رکھا، مذکورہ کھلونا میرے بیڈ کے نزدیک ہی ایک ٹیبل پر رکھا تھا۔ جب ڈاکو بیڈ روم میں داخل ہوئے تو میری آنکھ کھلی۔ اسے آپ ایک اتفاق سمجھیں یا میری خوش قسمتی کہ ڈاکوؤں پر نگاہ پڑتے ہی میرے دماغ نے برق رفتاری سے کام کیا اور میں نے ہاتھ بڑھا کر بڑھی سرعت سے ٹیبل پر سے وہ کھلونا اٹھا لیا۔ پھر گن کو ڈاکوؤں پر تانتے ہوئے میں للکارا۔

"خبردار!........ اگر آگے قدم بڑھایا تو میں گولی ماروں گا۔"

وہ دونوں نقلی گن کو اصلی سمجھ کر میری دھونس میں آ گئے۔ انہوں نے ٹھٹک کر ایک لمحے کے لئے، ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس دوران میں بیڈ سے نیچے اُتر آیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں انہیں کوئی اور خوف ناک دھمکی دیتا، وہ الٹے پاؤں فرار ہو گئے۔ ایک کھلونا گن کے خوف نے انہیں میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"بہت ہی کچے اور بزدل ڈاکو تھے۔"

اس کے خاموش ہونے پر میں نے خیال آرائی کی، پھر پوچھا۔

"لیکن شکیل صاحب! ڈاکوؤں والے اس مضحکہ خیز واقعے کا پولیس سے کیا تعلق ہے؟ آپ تو غالباً مجھے پولیس کے کسی خاص رویّے کے بارے میں بتا رہے تھے؟"

"میں اسی طرف آ رہا ہوں بیگ صاحب!" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "اور آپ نے اس واقعے کا مضحکہ خیز پورشن تو ابھی سنا ہی نہیں۔ سمجھ لیں کہ ابھی میں نے صرف ایک سین کی روداد پیش کی ہے۔ ابھی کچھ اور بھی سنسنی خیز مناظر باقی ہیں۔"

"جی، میں توجہ سے سن رہا ہوں۔ آپ بیان کرتے جائیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس ڈرامے کا ڈراپ سین خاصا دلچسپ ہو گا۔"

اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اس رات کا باقی حصہ تو ہم نے جیسے تیسے جاگ کر گزارا لیکن پھر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ اگلے روز آس پڑوس والوں کو اس واقعے کی خبر ہوئی۔ جس نے بھی نقلی گن اور ڈاکوؤں کی بزدلی کے بارے میں سنا، اپنی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق حسبِ توفیق تبصرہ بھی کیا۔ زیادہ تر لوگوں نے اسے مذاق کے رنگ میں لیا تھا اور ہم سے اظہارِ ہمدردی کے بجائے انہیں تفریح کی سوجھ رہی تھی۔ یہ سب تو چل ہی رہا تھا کہ دوپہر کے بعد ایک نئی مصیبت نازل ہو گئی۔"

وہ لمحے بھر کو تھما، ایک گہری مگر بوجھل سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"ہم لوگ لنچ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ پولیس آ دھمکی۔ مقامی تھانے کا ایک

سب انسپکٹر دو کانسٹیبلو کے ساتھ میرے دروازے پر آیا اور بتایا کہ وہ ایک اہم سلسلے میں مجھ سے ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے سب انسپکٹر کو اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اس کی آمد کی غرض و غایت کے بارے میں استفسار کیا۔

وہ خاصے گمبھیر لہجے میں گویا ہوا۔ ''دیکھیں جناب!...... نام کیا ہے آپ کا؟''

''شکیل۔'' میں نے بتایا۔ ''شکیل خان ولد جمیل خان۔''

''ہاں تو شکیل صاحب......!'' وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''دراصل، آج کل آتشیں اسلحے کے حوالے سے خاصی سختی ہو گئی ہے۔ ہمیں اوپر سے بہت دباؤ ڈالا جا رہا ہے، اس لئے ہم چیکنگ کے سلسلے میں سرگرداں رہتے ہیں۔''

''لیکن آتشیں اسلحے اور اس کی چیکنگ سے میرا کیا تعلق ہے؟'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اُلجھن زدہ انداز میں سوال کر ڈالا۔

سب انسپکٹر نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

''ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ کے پاس کبھی کوئی آتشیں ہتھیار ہے۔ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ کے پاس اس ہتھیار کا باقاعدہ لائسنس بھی ہے یا ایسے ہی رکھا ہوا ہے۔ آپ اسے معمول کی کارروائی سمجھیں اور ہمارے ساتھ تعاون کریں۔''

''جناب! پہلے تو یہ بتائیں کہ آپ کو کس نے اطلاع دی ہے کہ میرے گھر میں کوئی ہتھیار وغیرہ ہے؟'' میں نے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''لائسنس یافتہ اور غیر لائسنس یافتہ کی بحث تو بعد کی بات ہے۔''

''آپ اس چکر میں نہ پڑیں کہ ہم کو کس نے بتایا ہے۔'' وہ خشک لہجے میں بولا۔

''ہمارے معلومات حاصل کرنے کے اپنے ذرائع ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے خفیہ مخبر نہایت تن دہی سے اپنے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں۔ ہم انہی معلومات کی روشنی میں حرکت کرتے ہیں۔ بس، یہ سمجھ لیں کہ ہم کسی پر کچا ہاتھ نہیں ڈالتے۔''

''تو سب انسپکٹر صاحب! آپ بھی میری ایک بات غور سے سن لیں۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''آپ مجھ پر بہت ہی کچا ہاتھ ڈالنے آئے ہیں۔ اس گھر میں کسی نوعیت کا بڑا یا چھوٹا، ہلکا یا بھاری آتشیں اسلحہ موجود نہیں ہے۔''

''ہماری اطلاعات غلط نہیں ہو سکتیں۔'' وہ قدرے سخت لہجے میں بولا۔ ''ہماری

معلومات کے مطابق، آپ کے پاس ایک گن موجود ہے، جس کے بل پر آپ نے گزشتہ رات دو ڈاکوؤں کو پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔''

وہ لمحے بھر کے لئے رکا، پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولا۔

''شکیل صاحب! اب تو آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم کسی پر کچا ہاتھ نہیں ڈالتے...... کیوں؟''

''اوہ......!'' میں ایک بوجھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔ وہ تیکھے انداز میں بولا۔

''فوراً سب کچھ یاد آ گیا نا؟''

سب انسپکٹر کی تحقیق اور تفتیش مجھ پر واضح ہوئی تو میں پُرسکون ہو گیا۔ یہ سمجھ میں آ گیا کہ ڈاکوؤں والی بات میرے گھر سے نکل کر آس پڑوس میں پہنچی تھی اور پھر وہاں سے اُڑتی ہوئی کسی طرح متعلقہ تھانے تک رسائی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئی تھی۔ اور یہ سب انسپکٹر اسی سلسلے میں ایفی شینسی دکھانے آیا تھا۔

اس دوران وہ سب انسپکٹر یک ٹک میری آنکھوں میں دیکھتا رہا تھا۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر اثبات میں گردن ہلائی اور بڑی نرمی سے کہا۔

''ہاں، انسپکٹر صاحب! مجھے سب کچھ یاد آ گیا ہے۔ آپ نے حوالہ ہی ایسا دیا ہے کہ سب میرے ذہن میں تازہ ہو گیا لیکن افسوس کہ......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا، ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی اور مزید کہا۔

''افسوس اس بات کا ہے کہ آپ نے جس گن کا ذکر کیا، میرے پاس اس کا لائسنس نہیں ہے۔''

''یہ افسوس کی نہیں بلکہ سنگین جرم کی بات ہے۔'' مجھے نرم پڑتے دیکھ کر وہ شیر ہو گیا۔ ''آپ کو پتہ ہے، لائسنس کے بغیر آتشیں ہتھیار قانوناً جرم ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں سزا اور جرمانہ بھی ہو سکتا ہے۔''

میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر کیا، جیسے اس کی بات نے مجھے خوف زدہ کر دیا ہو، پھر قدرے منت ریز لہجے میں کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، انسپکٹر صاحب! واقعی لائسنس کے بغیر گھر میں ایک

خطرناک ہتھیار رکھ کر میں نے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے، لیکن اگر آپ چاہیں تو گھر کی بات گھر ہی میں ختم ہو سکتی ہے۔''

میں بڑے غیر محسوس انداز میں اس سے تفریح لے رہا تھا، لیکن اسے یقین ہو گیا کہ میں اس سے بری طرح خوف زدہ ہو گیا ہوں۔ شاید وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اس نے تصدیقی انداز میں استفسار کیا۔

''شکیل صاحب! کیا آپ مُک مُکا کی بات کر رہے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''میرا یہی مطلب ہے۔''

''آپ کی آفر کیا ہے؟'' اس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

''آپ اپنی ڈیمانڈ بتائیں، انسپکٹر صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

اس نے ایک لمحہ سوچا، پھر آواز دبا کر بولا۔

''میرا خیال ہے، پانچ ہزار ٹھیک رہیں گے۔''

''یہ تو بہت زیادہ ہیں جناب!'' میں نے مصنوعی پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''مذاق نہ کریں، شکیل صاحب! اب آپ اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہیں۔'' وہ چوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں اپنے علاقے میں رہنے والے ایک ایک شخص کی پوری خبر ہے۔ آپ چند روز پہلے ہی سعودی عرب سے پاکستان آئے ہیں۔ میں نے تو آپ کا خیال رکھتے ہوئے پاکستانی کرنسی میں ڈیمانڈ کی ہے، ورنہ........ اصولاً تو مجھے اس ''کام'' کے پانچ ہزار ریال طلب کرنا چاہئے تھے!''

''وہ تو ٹھیک ہے جناب!'' میں نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں آپ کا مطالبہ اس لئے پورا نہیں کر سکتا کہ وہ گن کی اصل قیمت سے کہیں زیادہ ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں........''

میں نے لحاتی توقف کیا، پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہ سوچ رہا ہوں، کیوں نہ وہ گن ہی تحفتاً آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ اس طرح نہ رہے گا بانس اور نہ ہی بجے گی بانسری۔ آپ کا کیا خیال ہے، سب انسپکٹر صاحب؟''

اس نے میرے استفسار کے جواب میں اپنا خیال کچھ اس انداز میں ظاہر کیا۔

''شکیل صاحب! آپ کی گن امپورٹڈ ہے یا درّہ میڈ؟''

''درّہ میڈ نہیں جناب!........ وہ میڈ اِن چائنہ ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے تفریح کا عمل جاری رکھا اور اسے بتایا۔ ''میں نے یہ گن وہیں کی ایک مارکیٹ سے خریدی تھی۔''

''کتنے میں........؟'' اس نے حریصانہ انداز میں پوچھا۔

''صرف دس ریال میں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اتنا سستا؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''کیا وہاں سعودیہ میں ہتھیار اتنی کم قیمت میں دستیاب ہیں؟''

''میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا، انسپکٹر صاحب!'' میں نے گول مول جواب دیا۔ ''میں نے یہ گن جتنے میں خریدی تھی، وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ہے۔''

''آپ کی بات سن کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔'' وہ بے اعتباری سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''بہرحال........ آپ گن تو لا کر دکھائیں۔''

میں سب انسپکٹر کے پاس سے اٹھا، گھر کے اندرونی حصے میں گیا اور وہ کھلونا گن لا کر اس کے حوالے کر دی، جس کی قصہ کہانی پچھلے آدھے گھنٹے سے جاری تھی۔

انسپکٹر مذکورہ گن کو ہاتھ میں لیتے ہی ایسے اچھلا جیسے میں نے اسے گن نہیں، بلکہ کوئی زہریلا ناگ تھما دیا ہو۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز خارج ہوئی۔

''یہ تو نقلی ہے........ بالکل بچوں کا کھلونا۔''

''جی ہاں۔ آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کک........'' اس کی بے یقینی عروج پر دکھائی دیتی تھی اور وہ اس کیفیت میں خود بخود ''آپ'' سے ''تم'' پر بھی اتر آیا تھا۔ ''کیا........ تم نے........ اس کھلونا گن کی........ مدد سے ڈاکوؤں کو فرار ہونے پر مجبور کیا تھا؟''

''بالکل........ واقعہ یہی ہے، انسپکٹر صاحب!'' میں نے چٹانی لہجے میں کہا۔

"آپ میرے گھر کے چپے چپے کی تلاشی لے سکتے ہیں۔ اس گھر میں سے کوئی بھی آتشیں اسلحہ یا خطرناک ہتھیار آپ کو نہیں ملے گا۔ وہ تو میری خوش قسمتی کہ ڈاکو اس کھلونے کو اصلی گن سمجھے اور ڈاکا ڈالنے کے بجائے دُم دبا کر بھاگ نکلے، ورنہ.......
آج صبح میں، آپ کے تھانے میں بیٹھا اس ڈکیتی کی رپورٹ لکھوا رہا ہوتا۔"

"وہ سب انسپکٹر تو اس ڈراپ سین پر سرپیٹ کر رہ گیا ہوگا۔" شکیل خان نے اپنے بیان میں تھوڑا وقفہ دیا تو میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"آپ کا اندازہ ایک حد تک درست ہے، بیگ صاحب!" شکیل معنی خیز لہجے میں بولا۔

"ایک حد تک.......کیا مطلب؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ "ایک حد تک اس طرح کہ وہ سب انسپکٹر اپنی تحقیق اور تفتیش کے اختتام پر، حقیقت واقعہ سامنے آنے پر واقعی سٹپٹا کر رہ گیا تھا۔ لیکن یہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین نہیں ہے، بیگ صاحب!"

"پھر ڈراپ سین کیا ہے؟" میں نے اُلجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

"ڈراپ سین نے تو ہمیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔" شکیل خان نے زہریلے لہجے میں بتایا۔ "اُس سہ پہر وہ سب انسپکٹر خجل سا ہو کر جھنجلاتے ہوئے واپس چلا گیا تھا، لیکن آنے والی رات ہمارے لئے قیامت خیز ثابت ہوئی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ظلمی رات کے آخری پہر، ڈھاٹا پوش ڈاکوؤں نے ایک مرتبہ پھر ہمارے گھر کو نشانہ ستم بنایا۔ اس مرتبہ بھی وہ تعداد میں دو ہی تھے۔ وہ بڑے غیظ وغضب میں نظر آتے تھے۔ لوٹ مار کے علاوہ انہوں نے مجھ پر یہ بھی واضح کر دیا کہ میں نے پچھلی رات انہیں جس طرح کھلونا گن سے بے وقوف بنایا تھا، یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ قیمتی اشیاء اور نقدی تو گئی ہی، اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے بے دردی سے زدوکوب بھی کیا اور جاتے ہوئے یہ دھمکی بھی دے گئے کہ اگر میں نے اس واقعے کی تھانے میں رپورٹ کی تو وہ میرے بیوی بچوں کو قتل کر دیں گے۔"

اتنا بتانے کے بعد شکیل خان خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے بے پناہ اذیت جھلک رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ اپنی زندگی کے انتہائی نازک اور تکلیف دہ

لمحات سے گزر رہا ہو۔ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"شکیل صاحب! پھر آپ نے کیا، کیا تھا؟"

"میں نے ان ڈاکوؤں کی دھمکی کے بالعکس ردِعمل ظاہر کیا تھا۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "میں تھانے پہنچا اور انہیں کھری کھری سنا ڈالیں۔ میں نے ان پر واضح کیا کہ اگر انہوں نے میرے ساتھ ہونے والی زیادتی کی رپورٹ درج نہ کی.......اور ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے مسروقہ مال مجھے واپس نہ لوٹایا تو میں بہت اوپر تک جاؤں گا۔ میرا دل بری طرح دُکھا ہوا تھا، لہٰذا میں نے انہیں بہت برا بھلا کہا۔ میں نے علی الاعلان کہا کہ پولیس اور ان ڈاکوؤں میں گہرا ربط ضبط ہے۔ پہلی رات وہ کھلونا گن سے ڈر کر فرار ہو گئے تھے، لیکن اگلے روز سب انسپکٹر کی تحقیق کے نتیجے میں جب انہیں اس حقیقت کا علم ہوا کہ میرے گھر میں کسی قسم کا کوئی اسلحہ موجود نہیں، وہ دیدہ دلیری سے دوبارہ مجھے لوٹنے آ گئے اور اس مرتبہ انہیں اپنے مذموم عزائم میں کامیابی ہوگئی۔"

"ہوں......." شکیل خان کے جذباتی بیان کو لمحاتی بریک لگے تو میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"تو کیا پولیس والوں نے ڈکیتی کی اس رپورٹ کے لئے آپ کی شکایت پر رپورٹ درج کر لی تھی؟"

"جناب! میں تھانے جا کر اتنا چیخا چلّایا تھا کہ میرے جوش کو دیکھتے ہوئے انہوں نے رپورٹ تو درج کر لی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "اور مجھے یقین ہے، وہ رپورٹ کچی ہی ہوگی۔"

"اس رپورٹ کے نتیجے میں کیا کوئی کارروائی بھی دیکھنے میں آئی؟"

"بالکل جناب!" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اسی روز سے پولیس والوں نے میرے گھر کے چکر کاٹنا شروع کر دیئے۔ ہر دفعہ انہیں نئے سرے سے یہ ساری تفصیل سنانا پڑتی کہ ڈاکو میرے گھر سے کیا کیا لوٹ کر لے گئے ہیں۔ وہ مجھے چڑانے کے لئے بڑے احمقانہ سوالات کرتے۔ مثلاً فلاں فلاں شے میں نے کب اور کہاں سے خریدی تھی اور کتنے میں خریدی تھی اور کیا میرے پاس اس خریداری کی رسیدیں بھی ہیں، وغیرہ وغیرہ......."

وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ان کے یہ خون جلانے والے سوالات سن سن کر میری برداشت جواب دے گئی اور ایک روز میں نے تفتیشی افسر کے کانوں کے کیڑے جھاڑ دیئے۔ میں نے دوٹوک اور اُکھڑے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

''دیکھیں جناب! میں تو یہ بات جانتا ہوں کہ اگر آپ لوگوں کی مرضی ہوگی تو پلک جھپکتے میں ڈاکو گرفتار ہو سکتے ہیں اور مسروقہ مال بھی برآمد۔''

تفتیشی افسر نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں آپ سے کوئی ہمدردی نہیں۔ ہم خوامخواہ اپنا اور آپ کا وقت برباد کر رہے ہیں۔ کیا آپ نے ہمیں اُلّو کا پٹھا سمجھا ہوا ہے؟''

''پتہ نہیں، وہ کیسے لمحات تھے بیگ صاحب! کہ مجھے بھی تاؤ آ گیا اور میں نے تفتیشی افسر کے سلگتے ہوئے سوالات کے جواب میں بڑی بہادری سے کہہ دیا۔

''جناب! آپ اُلّو کے پٹھے نہیں، بلکہ چابی کے لٹھے ہیں۔ میری طرح آپ بھی یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ میرے گھر میں ہونے والی ڈکیتی میں پولیس کا خفیہ ہاتھ کارفرما ہے۔ لہٰذا آپ میرے صبر اور ہمت کو آزمانے کی کوشش نہ کریں۔ اگر آپ نے ڈاکوؤں کو گرفتار کر کے لوٹا ہوا مال مجھے واپس نہیں دلانا تو صاف انکار کر دیں، تاکہ میں ڈاکوؤں کے بجائے آپ کے خلاف کوئی قانونی چارہ جوئی کر سکوں۔''

یہ سننا تھا کہ وہ تفتیشی افسر ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ مجھے آنکھیں دکھاتے ہوئے غضب ناک انداز میں چلاّیا۔

''تو اس کا مطلب ہے، آپ ہمیں مجرم اور ڈاکوؤں کا ساتھی سمجھ رہے ہیں؟''

''تو اس میں شک والی کون سی بات ہے؟'' میں نے اُلٹا اسی سے سوال کر ڈالا۔

وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

''اور یہ آپ قانونی چارہ جوئی کی دھمکی کسی اور کو دیں۔ آپ قانون اور اس کے اختیارات کو ہم سے زیادہ نہیں جانتے۔ آپ کو جو بھی سانپ نکالنا ہے، نکال لو۔ ہمیں کوئی پروا نہیں۔ آپ ایس پی، ڈی آئی جی، آئی جی، ہوم منسٹر اور پرائم منسٹر تک جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں، آپ کی اپروچ کہاں تک ہے۔''

''ان دھمکی دار کلمات کے بعد تفتیشی افسر میرے گھر سے دفع ہو گیا اور اس دن کے بعد پھر پولیس میرے گھر نہیں آئی۔ میں نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس کوفت سے تو جان چھوٹی۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا، اس سے کئی بڑی کوفت میرا انتظار کر رہی ہے۔ ایک دو روز ہی گزرے تھے کہ انہوں نے مجھے تھانے بلانا شروع کر دیا۔ ہر مرتبہ یہ بہانہ ہوتا تھا کہ ہم نے چند جرائم پیشہ افراد کو گرفتار کیا ہے۔ آپ تھانے آ کر شناخت کریں کہ کیا ان میں وہ ڈاکو شامل ہیں، جنہوں نے آپ کے گھر میں ڈکیتی ماری تھی۔ کبھی اس بہانے سے بلایا جاتا کہ ہم نے کچھ مسروقہ سامان برآمد کیا ہے، اس کی پہچان کر لیں اور ہر مرتبہ........ میں بے کار قسم کا کاٹھ کباڑ دیکھ کر واپس آ جاتا۔ مجھے زچ اور ذلیل کرنے کا یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری ہی تھا کہ انہوں نے میری اذیت کو ناقابلِ برداشت بنانے کے لئے میرے چھوٹے بھائی کو ایک ناکردہ جرم میں پھانس کر بند کر دیا ہے........ اب آپ ہی بتائیں، میں کہاں غلط ہوں؟ آخر میرا قصور کیا ہے؟''

''شکیل صاحب!'' میں نے اس کی بات پوری توجہ سے سننے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ غلط یا قصوروار نہیں ہیں بلکہ میرے خیال میں بڑے سادہ ہیں۔ آپ نے اپنی اسی سادگی میں یہاں کی پولیس اور اس کے مزاج کو سمجھنے میں غلطی کی ہے، جس سے قدم بہ قدم آپ کی مشکلات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بس، اتنی سی بات ہے!''

''میں نے ڈکیتی والی واردات کے بارے میں تفصیلاً آپ کو بتا دیا ہے۔'' وہ میری طرف توقع بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ ایمانداری سے بتائیں........ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ میرے گھر میں ہونے والی ڈکیتی میں پولیس نے ڈاکوؤں کی بھرپور پشت پناہی کی تھی؟''

''ایسا بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس وقت ڈکیتی والے معاملے سے زیادہ گمبھیر مسئلہ خلیل خان کا ہے۔ آپ کو پچھلی باتیں بھلا کر تازہ ترین صورتِ حال پر فوکس کرنا ہوگا۔''

''پچھلی باتیں اور بیتے ہوئے تجربات اگر تلخ اور ترش ہوں تو انہیں فراموش کرنا

انتا آسان نہیں ہوتا، بیگ صاحب!'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔ اور میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں، لیکن........'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن بہرحال، اس سلسلے میں کوشش تو کی جاسکتی ہے۔''

''وہ تو میں کر رہا ہوں، کیونکہ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں آپ سے پھر وہی سوال کروں گا، جو ابتدا میں کیا تھا کہ کیا اس ملک میں انسانوں کو جینے کا کوئی حق نہیں ہے؟''

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''شکیل صاحب! یہ ملک کیا، دنیا کے ہر ملک میں، انسانوں کو پورا پورا جینے کا حق حاصل ہے۔ لیکن اس سلسلے میں انسانوں کو وہاں کے قوانین، اصول، قاعدے اور ماحول و مزاج کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے یہاں قانون، قاعدے اور اصول پر بگڑے ہوئے ماحول اور اکھڑے ہوئے مزاج کی حکمرانی ہے۔ جو لوگ ''جیسا دیس ویسا بھیس'' کے کلیے پر عمل پیرا ہیں، انہیں کم تکلیفیں اور پریشانیاں اٹھانا پڑتی ہیں اور جو لوگ آپ کی طرح کھرے اور حساس مزاج رکھنے والے ہوتے ہیں، وہ قدم قدم پر اذیت اور کوفت سے دوچار ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہ ہمارا قومی المیہ ہے اور دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ اللہ سب ٹھیک کر دے۔''

''مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا، بیگ صاحب!'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن آپ نے یہ بھی سن رکھا ہوگا کہ خدا نے کبھی اس قوم کی حالت نہیں بدلی........''

''جی ہاں، جی ہاں........ بالکل سن رکھا ہے۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

وہ چند لمحات تک گہری سوچ میں ڈوبا رہا، پھر ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ سچ ہے کہ میرے چھوٹے بھائی خلیل خان کا، سیٹھ منظور کے قتل میں کوئی ہاتھ نہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سیٹھ منظور کا قتل ہوا ہے۔ بیگ صاحب! اب یہ سب کچھ آپ پر منحصر ہے کہ خلیل کو اس مصیبت سے کیسے نکالتے ہیں۔ میں آپ کی فیس

کے علاوہ ہر قسم کا قانونی اور عدالتی خرچہ اُٹھانے کو تیار ہوں۔''

''یہ تو آپ کو اُٹھانا ہی ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اب آپ جذباتیت کو پسِ پشت ڈال کر بالکل نارمل انداز میں سوچ رہے ہیں۔''

''جناب! انسان کے اندر جذبات ہوں تو وہ جذباتی بھی ہو ہی جاتا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اب بتائیں، مجھے اپنے بھائی کی، باعزت رہائی کے سلسلے میں کیا کرنا ہوگا؟''

میں نے پوچھا۔

''شکیل صاحب! جو پولیس آفیسر پہلی مرتبہ آپ کے گھر گن کے حوالے سے پوچھ گچھ کرنے آیا تھا، کیا آپ اس کا نام جانتے ہیں؟''

''جی ہاں........'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اس سب انسپکٹر کا نام انور شاہ تھا۔''

''کیا بعد میں بھی یہی سب انسپکٹر آپ کے گھر چکر لگاتا رہا تھا؟'' میں نے ایک حوالے سے تصدیق ضروری سمجھی۔ ''میرا مطلب ہے، کیا انور شاہ ہی مالِ مسروقہ کو برآمد کرنے کے لئے تفتیشی افسر تعینات ہوا تھا؟''

''نہیں جناب!'' اس مرتبہ اس نے نفی میں جواب دیا۔ ''اس تفتیشی افسر کا نام منیر حسین تھا اور وہ عہدے کے اعتبار سے ایک اے ایس آئی تھا۔''

''ٹھیک ہے، شکیل صاحب!'' میں نے رف پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا بھائی اس وقت عدالتی ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔ میں کسی وقت متعلقہ تھانے جا کر اس سے ملاقات کرلوں گا۔ اس سے مختلف سوال و جواب کے علاوہ وکالت نامے اور دیگر ضروری کاغذات پر دستخط بھی لینا ہوں گے۔ آپ ایک کام کریں........ آپ نے خلیل خان کے دوست کا کیا نام بتایا تھا، جو ادھر بورڈ آفس کے قریب رہتا ہے؟''

''جی........ اس کا نام ندیم ہے۔'' اس نے جلدی سے جواب دیا۔

میں نے کہا۔

''آپ کسی وقت ندیم کو ساتھ لے کر میرے پاس آجائیں یا چاہیں تو اسے اکیلا بھی بھیج سکتے ہیں۔ میں اس سے چند ضروری اور اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

"ٹھیک ہے جناب! یہ میں کرلوں گا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے اپنی فیس وصول کر کے اسے رسید جاری کر دی۔ پھر ضروری ہدایات کے بعد اسے اپنے دفتر سے رخصت کر دیا۔ وہ جب میرے سامنے سے اُٹھا تو خاصا مطمئن تھا۔

اگلے روز وہ ندیم کو لے کر میرے دفتر آ گیا۔

میں نے تنہائی میں ندیم کا تفصیلی انٹرویو لے ڈالا اور اس کوشش کے نتیجے میں کافی کارآمد باتیں معلوم ہوئیں۔ علاوہ ازیں، میں نے تھانے جا کر ملزم خلیل خان سے بھی ملاقات کر لی، جو خاصی سود مند ثابت ہوئی۔ اس معلوماتی تفصیل کا ذکر گاہے بہ گاہے عدالتی کارروائی کے دوران میں ہوتا رہے گا۔

●.....●.....●

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کر دیا۔

میں نے اس مرحلے پر اپنے مؤکل کی ضمانت کرانے کے لئے چارہ جوئی کی، لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جج نے آئندہ پیشی کے لئے تاریخ دے کر ملزم کو جیوڈیشنل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔ اگلی تاریخ پندرہ دن بعد کی تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں اس کیس کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں سے آپ کو روشناس کرادوں، تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران آپ کسی قسم کی ذہنی اُلجھن کا شکار نہ ہوں۔ سب سے پہلے میں استغاثہ کی رپورٹ کا ذکر کروں گا۔

استغاثہ کی رپورٹ سے بھی پہلے میں اس کیس کے تفتیشی افسر کے بارے یں بتانا چاہوں گا۔ اس پولیس اہلکار کا نام انور شاہ تھا۔ یعنی وہی سب انسپکٹر جو آتشیں اسلحے کا سراغ لگانے کچھ عرصہ پہلے ملزم کے گھر آیا تھا اور اسی رات ملزم کے گھر میں باقاعدہ ڈکیتی کی واردات ہو گئی تھی، جس کی رپورٹ درج ہو جانے کے باوجود بھی ابھی تک مالِ مسروقہ کا کوئی نشان مل سکا تھا اور نہ ہی مذکورہ ڈاکوؤں کی گرفتاری عمل میں آئی تھی......اور ملزم خلیل خان کے بڑے بھائی شکیل خان کو ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ ان کے گھر میں ہونے والی ڈکیتی ڈاکوؤں اور پولیس کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا بلکہ اس کا دعویٰ تو یہاں تک تھا کہ پولیس ہی نے باقاعدہ جرائم پیشہ افراد کو اپنی

پناہ میں پال رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جرائم ہوتے ہیں، لیکن اکثر و بیشتر ملزم یا مجرم ہاتھ نہیں آتے۔ جب جرم کی بیخ کنی کرنے والے لوگ خود ہی جرائم میں ملوث ہوں گے تو پھر مجرم کہاں پکڑے جائیں گے۔"

استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق ملزم نے مقتول کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنی بے عزتی اور ذلت کا انتقام لیا تھا۔ وقوعہ کی شام، ملزم اپنے ایک دوست ندیم کے ساتھ مقتول کے ہوٹل میں آیا اور کھانے پینے کے کسی معاملے پر ان میں جھگڑا ہو گیا۔

مقتول نے بڑی نرمی اور پیار سے بات کی، اس کی کوشش تھی کہ ہوٹل کے اندر بدمزگی کی فضا قائم نہ ہو اور صلح صفائی سے معاملہ نمٹ جائے۔ اس نے ہوٹل کے بیرے کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ ملزم اور اس کے دوست کی شکایت دور کرنے کے لئے انہیں دوسرا کھانا سرو کر دے۔ لیکن ملزم کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ با آوازِ بلند ہوٹل، اس کے کھانے اور مالک ہوٹل یعنی مقتول سیٹھ منظور کو برا بھلا کہتا چلا گیا۔ جب پانی سر سے اوپر ہونے لگا تو مقتول نے اپنے ملازمین کی مدد سے، دھکے دے کر ملزم اور اس کے ساتھی کو ہوٹل سے باہر نکال دیا۔ ملزم نے ہوٹل چھوڑتے وقت مقتول کو سنگین نتائج کی دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ! تم یہ جو بھی کر رہے ہو، اپنے حق میں بہت ہی برا کر رہے ہو۔ تمہیں نہیں معلوم، میں کتنا خطرناک آدمی ہوں۔ جلد ہی تمہیں میں ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے!"

اور پھر اسی رات، جب سیٹھ منظور ہوٹل بند کر کے اپنے گھر کی جانب روانہ ہوا تو اسے قتل کر دیا گیا۔ مقتول کے ساتھ اس کا باورچی ارشاد علی بھی موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ اسی کی زبانی پتہ چلا کہ حملہ آور قاتل ملزم کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ارشاد کے مطابق، ملزم نے اپنی شناخت چھپانے کے لئے چہرے پر ڈھاٹا لگا رکھا تھا، لیکن مخصوص جسامت اور قد کاٹھ کے سبب اس نے ملزم کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی، چنانچہ ارشاد علی کی نشاندہی پر پولیس نے ملزم خلیل خان کو سیٹھ منظور کے قتل کے الزام میں اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول سیٹھ منظور کی موت نو اور دس فروری کی

درمیانی شب گیارہ اور بارہ بجے کے بیچ واقع ہوئی تھی۔ اسے قتل کرنے کے لئے حملہ آور نے اس پر دو گولیاں چلائیں اور یہ دونوں ہی فائر ہلاکت خیز ثابت ہوئے تھے۔ ایک گولی گردن میں اور دوسری دل میں پیوست ہو گئی تھی اور مقتول نے موقع پر ہی جان دے دی تھی۔ رپورٹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ یہ دونوں گولیاں پوائنٹ تھری ٹو کیلی بر کے ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ چند تکنیکی نوعیت کی موشگافیاں بھی تھیں، جن کا ذکر میں ضروری نہیں سمجھتا۔

ابتدائی چند پیشیوں میں کوئی قابلِ ذکر کارروائی نہیں ہوئی، لہٰذا میں یہاں سے گزر کر براہِ راست استغاثہ کے گواہوں اور ان کے بیانات کی طرف آتا ہوں تاکہ سنسنی خیزی کا تسلسل جاری رہے۔ اس دوران میں نے اپنی کوشش سے بھی بہت سی اہم معلومات اکٹھا کر لی تھیں۔

آئندہ پیشی پر جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی، میری ہدایت کے مطابق، ملزم نے صحتِ جرم سے صاف انکار کر دیا۔ پولیس کسٹڈی میں دیئے گئے بیان یا ملزم کے اقبالِ جرم کو عدالت کوئی اہمیت نہیں دیتی، لہٰذا پولیس والوں کے ظالمانہ تفتیشی ہتھ کنڈوں سے بچنے کے لئے عموماً حوالاتی اپنے کردہ یا ناکردہ جرم کا اقرار کر لیتے ہیں اور عدالت میں پہنچتے ہی اس بیان سے انحراف کرتے ہوئے صحتِ جرم سے انکار کر دیتے ہیں۔

استغاثہ کی طرف سے کُل پانچ گواہ فہرست میں شامل تھے، لیکن میں یہاں پر صرف انہی کا ذکر کروں گا، جو کیس کی مناسبت سے زیادہ اہمیت کے حامل ہوں گے، تاکہ آپ کے قیمتی وقت کو برباد ہونے سے بچایا جا سکے۔

استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔

جج نے فوراً میری یہ فرمائش پوری کر دی اور اس کے اشارے پر سب انسپکٹر انور شاہ، وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

انکوائری آفیسر یعنی تفتیشی افسر کی حیثیت کسی بھی کیس میں استغاثہ کے گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ سب انسپکٹر انور شاہ کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہو گی۔ قد درمیانہ، رنگت سانولی اور جسم مضبوط تھا۔

اس نے چھوٹی سی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی، اس کے چہرے کی بناوٹ اور آنکھوں کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک عیار اور چالاک شخص تھا۔

میں گواہوں والے کٹہرے کے قریب پہنچا، کھنکار کر گلا صاف کیا اور انور شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”شاہ صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب، کس نے اور کیسے دی تھی؟“

”اطلاع دینے والے بندے کا نام ارشاد علی ہے۔ وہ مقتول کے ہوٹل میں ایک عرصے سے، باورچی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور رات کو ہوٹل بند کر کے وہ مقتول کے ساتھ.......“

”اس تفصیل کی ضرورت نہیں، آئی۔ او صاحب!“ میں نے قدرے ترش لہجے میں قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سلسلے میں، استغاثہ کے گواہ اور مقتول کے باورچی اور ارشاد علی کو خود چیک کر لوں گا۔ آپ اپنے جواب کو میرے پوچھے ہوئے سوال تک محدود رکھیں۔“

اس ٹوکنے پر آئی۔ او نے ناپسندیدہ نظروں سے مجھے دیکھا، تاہم کسی قسم کا کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے وہ تلملا کر رہ گیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے قدرے اُکھڑے ہوئے انداز میں بتایا۔

”ارشاد علی نے کسی پبلک کال آفس سے لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے رات تھانے فون کر کے ہمیں بتایا تھا کہ اس کے سیٹھ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ ہمیں فون کرنے سے قبل وہ مقتول کے گھر والوں کو.......“

”میں نے کہا نا، اپنے جواب کو صرف میرے سوال تک محدود رکھیں، شاہ صاحب! گواہ سے متعلق معاملات میں باری آنے پر اسی سے ڈسکس کر لوں گا۔“ میں نے ایک مرتبہ پھر بڑی بے دردی سے اس کی بات کاٹ دی اور چند لمحات کے توقف کے بعد پُرسوچ انداز میں کہا۔

”وقوعہ کی رات آپ کو اس سنگین واردات کی اطلاع کم و بیش ساڑھے گیارہ بجے دی گئی، جس کے بعد آپ فوراً حرکت میں آ گئے۔ میں یہ جاننا چاہوں گا....... بلکہ اپنے توسط سے میں معزز عدالت کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ جائے

وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟"

اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔"رات بارہ سے چند منٹ پہلے!"

"چند منٹ پہلے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے اس کے الفاظ دہرائے۔"یہ چند منٹ کہاں سے شروع ہو کر کہاں تک جا سکتے ہیں........کیا ان کا تخمینہ منٹ ہی میں رہے گا یا دن، ہفتہ اور سال میں بھی بدل سکتا ہے؟"

الفاظ سے زیادہ میرا انداز اس کے لئے تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت تھا۔ اور میں یہ سب کچھ دانستہ کر رہا تھا۔ شکیل خان نے پولیس کے سابق رویّے خصوصاً سب انسپکٹر انور شاہ کے بارے میں مجھے جن تلخ حقائق سے آگاہ کیا تھا، وہ سب میرے ذہن میں محفوظ تھا اور میرے لہجے میں یہ کڑواہٹ اور کاٹ اسی کا نتیجہ تھی۔ اس نے میرے تازہ ترین سوال کو کڑوا گھونٹ سمجھ کر حلق سے اتارا اور پھنکار سے مشابہ آواز میں بولا۔

"وکیل صاحب! آپ اتنے بھی اسمارٹ نہیں ہیں، جتنا خود کو ظاہر کرتے ہیں۔ بہرحال، آپ کو منٹ کے حساب کتاب میں صدی دو صدی پیچھے نہیں جانا پڑے گا۔ اگر ایسا ہو گیا تو اس زمانے میں آپ ہوں گے، نہ میں اور نہ ہی قاتل و مقتول، لہٰذا......."

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔

"آپ کی اطلاع کے لئے عرض کر دوں کہ وقوعہ کے روز، رات گیارہ بج کر پچاس منٹ پر میں موقعِ واردات پر موجود تھا۔ آپ اس وقت کو آدھی رات سے دس منٹ پہلے کا ٹائم تصور کر لیں۔"

"تھینک یو فار دِس کوآپریشن۔" میں نے تشکرانہ انداز میں کہا۔"آئی۔ او صاحب! میں کتنا اسمارٹ ہوں، یہ آپ مجھ سے زیادہ نہیں جانتے اور نہ ہی جان سکتے ہیں۔ اینی ہاؤ، آپ کے مرکب "قاتل و مقتول" پر مجھے سخت اعتراض ہے۔" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ منظور قتل ہوا، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ چنانچہ حقائق کی روشنی میں اسے مقتول کہنے کا حق سب کو حاصل ہے۔ لیکن میرا مؤکل اس کیس میں ایک ملزم کی حیثیت کا حامل ہے، جس تک اس پر عائد کردہ قتل کا الزام ثابت نہیں ہو جاتا، کوئی اسے قاتل نہیں کہہ سکتا۔ خصوصاً آپ کو تو میں بالکل نہیں کہنے دوں گا، جناب آئی۔ او

صاحب!"

اس نے میرے اس تبصرے پر گھور کر مجھے دیکھا، تاہم جوابی تبصرہ کرنے سے گریز کرتے ہوئے وہ خاموش ہی رہا۔ مچھلی کو فرائی کرنے سے پہلے مخصوص مسالہ وغیرہ لگا کر تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میں نے بھی کچھ اسی نوعیت کے فارمولے پر عمل کیا تھا۔ انکوائری آفیسر پر پے در پے وار کر کے میں نے اس کے اعصاب اور دماغ کو جھنجنا دیا تھا۔ یہ میرا مخصوص اسٹائل ہے۔ میں اپنے مدِ مقابل شخص کو چاروں خانے چت کرنے سے پہلے دوڑا دوڑا کر ہانپنے پر مجبور کر دیتا ہوں، تاکہ اسے گرانے اور زمین چٹوانے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

"شاہ صاحب!" میں نے دوبارہ انکوائری آفیسر کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔"جب آپ وقوعہ پر پہنچے تو وہاں اچھے خاصے لوگ جمع ہو گئے ہوں گے؟"

"جی ہاں........درجن بھر افراد جائے واردات پر موجود تھے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔"کیا ان لوگوں میں مقتول کے گھر والے بھی شامل تھے؟"

"جی نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔"مقتول کا بیٹا اور بہو سوا بارہ بجے وہاں پہنچے تھے۔ حالانکہ انہیں ارشاد علی نے ہم سے پہلے اس المناک حادثے کے بارے میں بتا دیا تھا۔"

"آپ بغل سے اُٹھ کر آئے تھے، تفتیشی افسر صاحب! اور مقتول کے بیٹے اور بہو کو نیو کراچی سے آنا پڑا تھا، لہٰذا ان کا تاخیر سے پہنچنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ بہرحال...." میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ نے ملزم کو کتنے بجے اور کہاں سے گرفتار کیا تھا؟"

"رات ساڑھے بارہ بجے........اس کے گھر سے۔" میں نے ترنت جواب دیا۔

"وَنڈرفل!" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ساڑھے گیارہ بجے رات آپ کو اطلاع ملتی ہے کہ ایک شخص کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔ آپ آناً فاناً میں گیارہ پچاس پر جائے واردات پر پہنچ جاتے ہیں اور پھر تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ٹھیک ساڑھے بارہ بجے آپ ملزم کو اس کے گھر سے

گرفتار کر لیتے ہیں۔ ہاؤ امیزنگ........“

”اس میں کون سی بات آپ کو ہضم نہیں ہو رہی؟“ وہ رُکھائی سے بولا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”یہ والی نئی ڈش کہ........ پولیس اس قدر مستعدی کا مظاہرہ بھی کر سکتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی فلم یا ڈرامے کا سین ہو........ یا پھر کسی سوچے سمجھے ڈرامے کا ڈراپ سین........ ہے نا؟“

”آپ کی سوچ پر کوئی پابندی تو عائد نہیں کی جا سکتی، وکیل صاحب!“ وہ گہری چوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ”بہرحال، جو حقیقت تھی، وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے۔ یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ جیسے لوگوں ہی نے عوام کی نظروں میں پولیس ڈیپارٹمنٹ کا امیج خراب بلکہ بگاڑ رکھا ہے۔ ورنہ پولیس نے تو ہمیشہ ایسی ہی مستعدی کا مظاہرہ کیا ہے۔“

”ہاں، کیوں نہیں۔“ میں نے استہزائیہ انداز میں ہاتھ لہرا کر کہا۔ ”سعودیہ سے آئے ہوئے کسی پاکستانی کے گھر میں ناجائز اسلحے کی تلاش کا معاملہ ہو، ڈاکوؤں کی رہنمائی اور پشت پناہی ہو یا مالِ مسروقہ کی بازیابی کے لئے متاثرہ خاندان کو ناک سے لکیریں نکلوانے کے مراحل..... پولیس کی مستعدی اور اعلیٰ کارکردگی کسی تعریف کی محتاج نہیں۔“

”آبجیکشن یور آنر!“ وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت عدالت میں سیٹھ منظور مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے، لیکن میرے فاضل دوست کہیں اور ہی نکل گئے ہیں۔ انہیں غیر متعلقہ معاملات کو چھونے سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔“

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وکیل صاحب! یہ ڈاکوؤں، ناجائز اسلحے اور مالِ مسروقہ کا کیا قصہ ہے؟ کیا زیرِ سماعت کیس سے اس کا کوئی تعلق بنتا ہے؟“

میں نے استفساریہ نظر سے انکوائری آفیسر کو دیکھا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”یور آنر! جس طرح کسی انکوائری آفیسر کا کیس کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے،

بالکل اسی طرح ان امور کا بھی زیرِ سماعت کیس سے تعلق بنتا ہے بلکہ اس تعلق کا سبب انور شاہ آئی۔ او ہی ہیں۔ لیکن.......“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا، پھر اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

”میں محسوس کر رہا ہوں کہ شاید یہ ذکر کچھ جلدی کر دیا ہے۔ بہرحال، آئی۔ او صاحب نے اس کیس کے آخر تک عدالت میں موجود رہنا ہے، لہٰذا گاہے بہ گاہے یہ سلسلہ بھی چلتا رہے گا۔“

جج نے دلچسپی بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور معنی خیز انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ میں نے کن انکھیوں سے انکوائری آفیسر کا جائزہ لیا۔ وہ معاندانہ انداز میں مجھے ہی گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر مجھے تسلی ہو گئی کہ میں اس کی سوچ اور خیالات میں جو انتشار پیدا کرنا چاہتا تھا، اس میں خاطر خواہ کامیاب ہو گیا تھا۔

”آئی۔ او صاحب! واردات کی اطلاع ملتے ہی آپ آندھی طوفان کے مانند گیارہ پچاس پر جائے وقوعہ پر پہنچ جاتے ہیں اور پھر ٹھیک ساڑھے بارہ بجے ملزم آپ کی گرفت میں آ جاتا ہے۔“ میں نے گھسنے کے عمل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کریں گے کہ صرف چالیس منٹ کے اندر قاتل ”آپ کی دانست میں“ کی گرفتاری کے عمل میں آپ کو تائیدِ غیبی حاصل رہی ہے یا آپ جادو وغیرہ جانتے ہیں؟“

”آپ جب تک ہر بات کو توڑ موڑ کر اور اس کا حلیہ بگاڑ کر نہ پیش کریں، شاید آپ کو چین نہیں آتا۔“ وہ جلے کٹے لہجے میں بولا۔ ”میں آپ کو بتا چکا ہوں اور استغاثہ کی رپورٹ میں اس واقعے کی تفصیل درج ہے کہ وقوعہ کی رات ہوٹل بند کرنے کے بعد مقتول سیٹھ منظور اپنے ایک ملازم ارشاد احمد باورچی کے ہمراہ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر گھر کی جانب روانہ ہوا تھا۔ جب یہ واقعہ ہوا، ارشاد احمد موقع پر موجود تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ملزم نے مقتول کے سینے پر دو گولیاں برسائیں، پھر اس کی واسکٹ کی جیب میں سے ساری رقم نکال کر فرار ہو گیا۔“

وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”وکیل صاحب! لگتا ہے، آپ نے استغاثہ کی رپورٹ کو غور سے نہیں پڑھا؟“

''ہاں، میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔

وہ غیر یقینی انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ شاید میری بات اس کے پلّے نہیں پڑی تھی، تاہم وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ میں نے گمبھیر انداز میں استفسار کیا۔

''آئی۔ او صاحب! یہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ دورانِ واردات استغاثہ کے گواہ ارشاد علی نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو مقتول پر فائرنگ کرتے اور اس کی واسکٹ کی جیب میں سے رقم نکالتے ہوئے دیکھا تھا؟........ آپ نے چند لمحے پہلے کچھ اسی قسم کی بات کی ہے نا؟''

اس کے چہرے اور آنکھوں میں اُلجھن کا جال سا پھیل گیا، تاہم جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بے شک، اس نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، لیکن رپورٹ میں اس امر کی وضاحت بھی موجود ہے کہ واردات کے وقت ملزم نے اپنے چہرے کو ڈھاٹے کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ گواہ نے ملزم کے قد کاٹھ اور جسامت سے اسے پہچان لیا تھا۔ بس، اتنی سی بات ہے۔''

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے، شاہ جی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''شاید آپ کو احساس نہیں کہ آپ کتنا بڑا دعویٰ کر رہے ہیں۔''

''دعویٰ........'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔ ''میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے وکیل صاحب؟''

''آپ کے کہنے کا مطلب یہ نکلتا ہے، آئی۔ او صاحب!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہ پورے شہر میں ملزم کی جسامت اور قد کاٹھ کا صرف ایک ہی شخص موجود ہے، یعنی خود ملزم۔ جبھی گواہ ارشاد علی نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا........ اور یہ بڑا ہی خطرناک اور غیر ذمہ دارانہ دعویٰ ہے۔''

میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا، جناب!'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی گڑبڑاہٹ کا فوراً فائدہ اٹھایا اور اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر کہا۔

''آپ کا یہ مطلب نہیں تھا........ یعنی آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ملزم کے قد کاٹھ اور جسامت کے دو چار افراد اور بھی اس شہر میں موجود ہوں گے؟''

''ہاں........ ایسا بالکل ہوسکتا ہے۔'' اس کے لہجے کا اعتماد کہیں فرار ہو گیا تھا۔

میں نے قدرے درشت انداز میں کہا۔

''آپ کے مطابق، اگر ایسا ہوسکتا ہے تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یہ واردات ملزم کی جسامت اور قد کاٹھ والے کسی اور شخص نے کی ہو۔ حملہ آور قاتل نے چونکہ چہرے پر ڈھاٹا لگا رکھا تھا، اس لئے استغاثہ کا گواہ ارشاد علی، صورت آشنائی کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس نے ایسا دعویٰ کیا ہے۔ اس نے قاتل کی شناخت کے سلسلے میں ایک گیس، ایک اندازہ قائم کیا اور آپ نے ڈانگ سوٹا لے کر ملزم پر چڑھائی کر دی، اسے گرفتار کر کے لے گئے اور پھر بعد ازاں اسے عدالت کے حوالے کر دیا۔ اللہ اللہ، خیر سلاّ........ نہ بھاگ دوڑ اور نہ ہی محنت مشقت۔ آپ کا کام چٹکی بجاتے میں ہو گیا۔ آپ نے تو یہ سوچنے اور سمجھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور نہ ہی ملزم کی بات پر یقین کیا کہ وہ رات گیارہ اور بارہ بجے کے دوران جائے وقوعہ سے میلوں دور تھا۔''

''اگر ملزم نے........ سیٹھ منظور کو قتل نہیں کیا تو پھر........ کس نے کیا ہے؟'' وہ چیخ کر بولا۔ ''وکیل صاحب! آپ حقائق کی شکل بگاڑ کر اس کیس کو کسی اور رخ پر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''واہ، واہ........ سبحان اللہ!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''یہ خوب فرمایا آپ نے، آئی۔ او صاحب!........ میں تو اس کیس کے مختلف پہلوؤں کو گھس مانجھ کر نکھارنے اور سنوارنے کی کوشش کر رہا ہوں اور آپ اُلٹا مجھ ہی کو الزام دے رہے ہیں۔ اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر میرے چند سوالات کے جواب دیں۔''

میں نے لمحاتی توقف کیا، پھر آئی۔ او کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں مقتول کی موت کا وقت کیا بتایا گیا ہے؟''

''نو فروری........ رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان۔'' اس نے جواب دیا۔

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو ان حقائق سے تقویت ملتی ہے۔'' میں نے دلائل کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''نمبر ایک، استغاثہ کے گواہ ارشاد علی کے مطابق، انہوں نے رات گیارہ بجے ہوٹل بند کیا اور گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ پھر چند منٹ بعد ہی یہ اندوہ ناک واقعہ پیش آ گیا۔ نمبر دو، ارشاد علی نے سب سے پہلے مقتول کے

گھر فون کر کے اس حادثے کی اطلاع دی، بعد میں پولیس اسٹیشن فون کیا۔ ارشاد علی کے بیان کے مطابق، اس نے سوا گیارہ بجے مقتول کے گھر فون کیا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ قتل اور لوٹ مار کا یہ سانحہ رات گیارہ اور سوا گیارہ کے درمیان کسی وقت پیش آیا۔ نمبر تین، آپ واردات کی اطلاع پا کر آناً فاناً میں جائے وقوعہ پر پہنچے تھے۔ آپ کے بیان کے مطابق، رات گیارہ بج کر پچاس منٹ پر اور اس وقت تک سیٹھ منظور اس دنیا کو خیر باد کہہ کر کسی اور دنیا کا باسی بن چکا تھا۔ ہر زاویے سے یہی جھلکتا ہے کہ مقتول کی موت رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی اور قتل و لوٹ مار والا واقعہ بھی اسی عرصہ کے دوران پیش آیا۔ لیکن جب آپ مبینہ قاتل کو گرفتار کرنے اس کے گھر پہنچتے ہیں تو ملزم اور اس کے گھر والے آپ کو چند حقائق سے آگاہ کرتے ہیں، مگر آپ ان کی ایک سن کر نہیں دیتے۔ کیوں...... آخر کیوں؟"

میں نے اپنی جرح کو سوالیہ موڑ پر بریک لگائے تو جج نے گہری دلچسپی ظاہری کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"وکیل صاحب! آپ کن حقائق کی بات کر رہے ہیں؟"

"جناب! یہ حقائق کہ......" میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ "ملزم کے بھائی شکیل خان نے آئی۔ او صاحب کو بتایا تھا کہ ملزم دس پندرہ منٹ پہلے یعنی قریباً سوا بارہ بجے گھر آیا تھا۔ وہ رات کے ابتدائی حصے ہی میں اپنے دوست ندیم کے ہمراہ اس کے گھر چلا گیا تھا، جو پاپوش سے تھوڑے ہی فاصلے پر بورڈ آفس کے علاقے میں رہتا تھا۔ سرِ شام مقتول کے ساتھ اس کے ہوٹل میں ہونے والی بدمزگی نے دونوں دوستوں کا موڈ خراب اور طبیعت مکدر کر دی تھی۔ ہوٹل سے نکلنے کے بعد ملزم، ندیم کے ساتھ اپنے گھر پہنچا، پھر بڑے بھائی کو بتایا کہ وہ بورڈ آفس کی طرف جا رہا ہے اور واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔" آپ لوگ پریشان نہ ہویئے گا، ندیم مجھے اپنی بائیک پر چھوڑ جائے گا۔"

میں نے لمحاتی توقف کیا، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"یور آنر! پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ ندیم نے ملزم کو اپنی بائیک پر بٹھا کر اس کے گھر چھوڑا اور واپس چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد پولیس آ دھمکی اور انہوں نے میرے

مؤکل کو سیٹھ منظور کے قتل کے الزام میں اریسٹ کر لیا۔ دیٹس دی فل اسٹوری، یور آنر!"

میں نے بات ختم کر کے دونوں ہاتھوں کو کچھ ایسے انداز میں حرکت دی، جیسے کام کسی کی تکمیل پر میں دونوں ہاتھ جھاڑ کر اپنی کامیابی کا اعلان کر رہا ہوں۔ جج نے عینک کے اوپر سے تفتیشی افسر کی طرف دیکھا اور استفسار کیا۔

"سب انسپکٹر صاحب! کیا ملزم کے بھائی نے واقعی ایسی کوئی وضاحت کی تھی؟"

"ایسا ہوا تھا، جناب!" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ "لیکن ظاہر ہے، میں اس کی بات پر یقین کیسے کر سکتا تھا؟ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو بچانے کے لئے کوئی بھی سچی جھوٹی کہانی گھڑ کر سنا سکتا تھا۔ ہمیں اپنے انداز میں تفتیش کرنا پڑتی ہے۔ اگر ہم مجرموں اور ان کے لواحقین کی وضاحتوں پر آنکھ بند کر کے اعتبار کرنے لگیں تو پھر ہو گیا کام!" آئی۔ او نے بات ختم کر کے نفرت انگیز نظروں سے مجھے دیکھا، میں نے بھی اس معاندانہ نظر کا حساب فوراً چکتا کر دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنسنی خیز لہجے میں دریافت کیا۔

"شاہ جی! مجھے پتہ چلا ہے، وقوعہ کی رات آپ نے ملزم کے بھائی کی کسی بھی وضاحت کو اس لئے لائق توجہ نہیں جانا تھا کہ اس طرح آپ اس سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ ماضی میں...... ماضی قریب میں شکیل خان نے آپ کو پورے پانچ ہزار روپے کا نقصان پہنچایا تھا۔ آپ نے سوچا، موقع اچھا ہے، شکیل خان نہ سہی، اس کے چھوٹے بھائی خلیل خان کو اگر سیٹھ منظور کے قتل میں پھانس لیا جائے تو اس سے بہتر اور کوئی انتقام ہو ہی نہیں سکتا۔ ہے نا؟"

"یہ کیا آپ اوٹ پٹانگ پھینک رہے ہیں؟" آئی۔ او نے سلگتے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "میں بھلا ملزم کے بھائی سے کس بات کا انتقام لوں گا؟ اور یہ پانچ ہزار روپے کا کیا قصہ ہے؟"

"مائی ڈیئر آئی۔ او صاحب!" میں نے الفاظ کو زہریلے پیرہن میں چھپاتے ہوئے کہا۔ "آپ کو اچھی طرح یاد ہو گا، ماضی قریب میں، آپ ناجائز اسلحے کی تلاش کے سلسلے میں ملزم کے گھر گئے تھے اور ملزم کے بڑے بھائی شکیل خان سے آپ نے

مطالبہ کیا تھا کہ اگر وہ پانچ ہزار روپے بطور نذرانہ آپ کی خدمتِ عالیہ میں پیش کر دے تو آپ اس معاملے کو رفع دفع کر دیں گے۔ لیکن شکیل خان نے رشوت کے پانچ ہزار روپے دینے کے بجائے مذکورہ گن ہی بطور تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کر دی تھی، جو بعد ازاں ایک کھلونا گن ثابت ہوئی اور آپ پاؤں پٹخ کر ملزم کے گھر سے واپس آ گئے۔ اسی رات ملزم کے گھر میں ڈکیتی ہوئی اور........"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور تیز نظر سے آئی او کو گھورنے لگا۔

"مجھے سخت اعتراض ہے، جنابِ عالی!" وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "وکیل صفائی ایک مرتبہ پھر پٹری سے اُتر گئے ہیں۔ اس وقت عدالت میں بیٹھ منظور مرڈر کیس زیرِ سماعت ہے اور موصوف غیر متعلق کہانیوں میں الجھ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں اس نوعیت کے ہتھ کنڈوں سے فوری طور پر روکا جائے۔"

میں اپنے مخصوص انداز میں گاہے بہ گاہے ماضی قریب والے واقعے کا ذکر کر کے جج کی دلچسپی کو ہوا دینے کی کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کچھ بھی تھا، لیکن یہ واقعہ مضحکہ خیز ہونے کے علاوہ بے حد تفریح اور دلچسپی کا حامل بھی تھا۔ جج نے حسبِ توقع مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"بیگ صاحب! آپ قسطوں والی پالیسی کو ترک کر کے یک مشت یہ واقعہ بیان کر دیں، تا کہ زیرِ سماعت کیس کی کارروائی بار بار ڈسٹرب نہ ہو!"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا، اثبات میں سر ہلایا اور وکیل استغاثہ اور آئی او پر ایک اچٹتی نظر ڈالنے کے بعد روئے سخن جج کی جانب موڑا، پھر نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں شکیل خان کی فیملی کو پیش آنے والے ڈکیتی کے مضحکہ خیز اور افسوس ناک واقعے کی روداد سنا دی۔ میں نے اس داستانِ عجیب و غریب کا اختتام بڑے واضح اور جذباتی انداز میں کیا۔

"یور آنر! ماضی قریب میں پیش آنے والے اس اندوہ ناک واقعے کی روشنی میں ملزم کے بڑے بھائی شکیل خان کا یہ خیال تھا کہ پولیس نے اپنی انسلٹ کا بدلہ لینے کے لئے اس کے چھوٹے بھائی کو منظور مرڈر کیس میں پھانسنے کی کوشش کی ہے........"

میں نے سانس لینے کے لئے توقف کیا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"شکیل خان کا خیال غلط ہے یا درست، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ اور میں وکیل استغاثہ کے اس اعتراض سے بھی متفق ہوں کہ یہ سراسر غیر متعلق واقعہ ہے۔ میں معزز عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے مؤکل کی بریّت کے لئے میں اس واقعے کا قطعاً سہارا نہیں لوں گا۔ کیس کے حوالے سے میری تیاری اور ہوم ورک اتنا مضبوط ہے کہ میں ملزم کو اس کیس سے ایسے نکالوں گا، جیسے مکھن سے بال نکالا جاتا ہے مگر........ ماضی قریب کے اس شرم ناک واقعے کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو میں معزز عدالت کے سامنے ضرور لاؤں گا۔"

میں نے تھوڑا توقف کر کے حاضرینِ عدالت، وکیل استغاثہ، انکوائری آفیسر اور جج کی سمت دیکھا، میں نے "کچھ بھی نہ کہا اور سب کچھ کہہ بھی گئے" کا حامل بیان دے کر وہاں موجود ہر ذی روح کو متاثر اور مسحور بلکہ ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ سب کی نگاہیں مجھ ہی پر جمی تھیں کہ میں آگے کیا بولوں گا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جنابِ عالی!" میرا مخاطب کرسیِ انصاف پر براجمان جج تھا۔ "مضحکہ خیز اور سازش بھری ڈکیتی میں جہاں ڈاکو گھر کا دیگر قیمتی سامان سمیٹ کر لے گئے، وہیں ایک طلائی جڑاؤ کنگن بھی جاتا رہا۔ مذکورہ کنگن ملزم کی والدہ ماجدہ بیگم گل جان کا تھا، جو اس کے شوہر نے منہ دکھائی میں اسے دیا تھا۔ بوڑھی گل جان سالہا سال سے اس کنگن کو سنبھالے بلکہ سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ خاص طور پر شوہر جمیل خان کی وفات کے بعد تو وہ کنگن گل جان کی زندگی میں اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ معزز عدالت اس بات کا بخوبی اندازہ اور احساس کر سکتی ہے کہ ڈاکوؤں کی ذلالت بھری حرکت سے اس ضعیف خاتون کے دل و دماغ کو کتنی ٹھیس پہنچی ہو گی۔ جبکہ وہ سانس کی مریضہ بھی ہے لیکن........" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر آئی۔ او کی طرف دیکھا، پھر نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ظالم اور سفاک لوگوں کی نظر میں انسانی جذبات اور احساس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ ان کی نظر صرف اپنے مفاد پر ہوتی ہے اور یہ مفاد حاصل کرنے کے لئے وہ

انسانوں کے خون میں ہاتھ رنگنے سے باز آتے ہیں اور نہ ہی مُردوں کے کفن چرانے سے۔"

میں خاموش ہوا تو جج گردن جھکا کر اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کرنے لگا، پھر میری جانب دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

"بیگ صاحب! یہ واقعہ واقعی بڑا افسوس ناک اور قابلِ مذمت ہے۔ لیکن استغاثہ کے مطالبے کو دیکھتے ہوئے اور جیسا کہ آپ نے بھی تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ آپ زیرِ سماعت کیس پر اس واقعے کی پرچھائیں نہیں پڑنے دیں گے، لہٰذا عدالت آپ سے کہتی ہے کہ آپ اپنے ان پوائنٹس کی طرف آجائیں، جن کی بنا پر آپ اپنے مؤکل کو باعزت بری کروانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"اوکے یور آنر!" میں نے سرِتسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ پھر وٹنس باکس میں کھڑے انکوائری آفیسر کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"شاہ جی! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول سیٹھ منظور کو اعشاریہ تین دو کیلی بر کے ریوالور سے ہلاک کیا گیا ہے۔ اس پر دو گولیاں چلائی گئیں، جن میں سے ایک اس کی گردن میں اور دوسری دل میں پیوست ہوگئی۔ چنانچہ اس کی فوری موت واقع ہوئی۔ آپ نے بڑی مستعدی دکھائی اور آناً فاناً میں مبینہ قاتل کو گرفتار کر لیا۔ لیکن ابھی تک آلۂ قتل کی کہیں ایک جھلک دیکھنے کو نہیں ملی۔ قاتل قابو میں ہو تو آلۂ قتل برآمد کرانا کون سا مشکل ہوتا ہے۔ مگر آپ نے اس سلسلے میں کوئی کارکردگی نہیں دکھائی۔ کیوں؟"

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

"ہم نے ملزم کی گرفتاری کے بعد اس کے گھر کی مکمل تلاشی لی تھی، لیکن آلۂ قتل ہمارے ہاتھ نہیں لگا۔ ریمانڈ کی مدت کے دوران بھی ہم نے اس کی زبان کھلوانے کی پوری کوشش کی، مگر کامیابی نہیں ہوسکی، جس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ملزم نے مذکورہ ریوالور کو کسی گٹر وغیرہ میں پھینک دیا ہوگا۔"

"ایک تو آپ کسی نتیجے پر فوراً پہنچ جاتے ہیں، شاہ صاحب!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "بہرحال، مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ ایک ہی گھر میں آپ کو دو مرتبہ تلاشی

کے لئے جانا پڑا۔ پہلے کھلونا گن کی تلاش میں اور بعد ازاں آلۂ قتل کی برآمدگی کے سلسلے میں۔ لیکن اگر آپ پسند فرمائیں تو میں آپ کو یہ راز بتا سکتا ہوں کہ آپ کو اس رات ملزم کے گھر سے آلۂ قتل کیوں نہیں ملا تھا۔"

"کیوں؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "کیوں نہیں ملا تھا؟"

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"اس لئے نہیں ملا تھا کہ اس کا آلۂ قتل سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ جب اس نے سیٹھ منظور کو قتل ہی نہیں کیا تو اس کے پاس سے کسی ریوالور کی برآمدگی کا کیا سوال؟

انکوائری آفیسر انور شاہ نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا کہ اگر اسے فری ہینڈ دے کر موقع فراہم کیا جائے تو وہ مجھے کچا چبانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرے گا۔ میں نے اپنے کام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"آئی۔ او صاحب! قتل کی اس واردات کے ساتھ لوٹ مار کا ایک واقعہ بھی جڑا ہوا ہے۔ آپ نے تھوڑی دیر پہلے معزز عالت کے روبرو بتایا تھا کہ استغاثہ کے گواہ ارشاد علی کے بیان کے مطابق، ملزم نے پہلے مقتول پر دو گولیاں برسائیں، پھر اس کی واسکٹ کی جیب میں سے پانچ ہزار روپے نکال کر فرار ہوگیا۔ میرا آپ سے صرف اتنا سا سوال ہے......" میں نے لحاتی توقف کیا، ایک گہری سانس چھوڑی، پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ نے ملزم کی جامہ اور خانہ تلاشی کے دوران پانچ ہزار روپے کی وہ رقم برآمد کر لی تھی؟......اور اگر کر لی تھی تو پھر کہیں اس کا ذکر کیوں نہیں ہے؟"

"ہم وہ رقم برآمد نہیں کر سکے۔" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔ "لگتا ہے، ملزم نے مذکورہ رقم کو کہیں ٹھکانے لگا دیا ہے۔"

میں نے روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"یور آنر!" میرے لہجے میں بڑا گہرا طنز شامل تھا۔ "ہماری اسکاٹ لینڈ یارڈ ملزم سے آلۂ قتل اس لئے برآمد نہیں کرسکی کہ اس نے واردات کے بعد وہ ریوالور کسی گٹر میں پھینک دیا تھا اور مسروقہ رقم اس لئے دستیاب نہیں ہوسکی کہ ملزم نے نہایت ہی خفیہ طور پر ان پانچ ہزار کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ ریمانڈ کی مدت کے دوران بھی یہ ملزم کی زبان

کھلوانے میں ناکامیاب و ناکامران رہے ہیں۔ جب کہ ہماری ''اسکاٹ لینڈ یارڈ'' کے بارے میں برطانیہ کی اسکاٹ لینڈ یارڈ بھی یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ یہ لوگ بجلی کے ایک کھمبے سے بھی اقرارِ جرم کروانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور اگر پوچھ تاچھ کے نام پر کسی شیر ببر کو بھی ان کے حوالے کر دیا جائے تو ایک دن کی مہمان داری کے بعد وہ ہاتھ جوڑ کر یہ فریاد کرتا ملے گا........ بھائی لوگو! میری صرف شکل وصورت اور رنگ روپ جنگل کے بادشاہ ایسا ہے، ورنہ حقیقت میں تو میں نرا گدھا ہوں۔''

میں سانس لینے کے لئے ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، کندھے اچکائے اور روئے سخن بدستور جج کی طرف رکھتے ہوئے اپنا بیان پُر دلائل جاری رکھا۔

''یور آنر! مقتول سیٹھ منظور نے وقوعہ کی رات ٹھیک گیارہ بجے ہوٹل بند کیا اور اپنے باورچی ارشاد علی کے ہمراہ گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔ ارشاد علی کے مطابق، اس نے اپنے سیٹھ کے قتل کی خبر دینے کے لئے سب سے پہلے اس کے گھر فون کیا تھا........ یعنی سوا گیارہ بجے۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ مقتول کی موت رات گیارہ اور سوا گیارہ یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے گیارہ کے درمیان واقع ہوئی۔ اس قتل کا الزام میرے مؤکل پر عائد کیا جا رہا ہے، جبکہ وہ اس دوران جائے وقوعہ سے خاصے فاصلے پر موجود تھا۔ لہٰذا وہ کس طرح اس قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے؟........ یور آنر! میرا مؤکل بے قصور اور بے گناہ ہے۔ ایک سوچی بوجھی اور سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے اس کیس میں فٹ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، جبکہ صورتِ حال کی اصل شکل میں نے معزز عدالت کے سامنے واضح کر دی ہے۔''

میں خاموش ہوا تو جج نے گہری سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلایا، پھر معنی خیز سوالیہ نظروں سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وکیل استغاثہ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''میرے فاضل دوست! آپ نے بہت بڑھ چڑھ کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ واردات اور مقتول کی موت کے ممکنہ و مبینہ وقت کے دوران ملزم جائے وقوعہ سے خاصے فاصلے پر موجود تھا۔ کیا آپ معزز عدالت کے سامنے اس کی وضاحت فرمائیں گے؟''

''مائی ڈیئر کونسلر! آپ کوئی فرمائش کریں اور میں اسے پورا نہ کروں، یہ نہیں ہو سکتا

جنابِ عالی!'' میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر طنزیہ لہجے میں کہا۔

''عرض کیا ہے........'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وقوعہ کی شام، مقتول کے ہوٹل میں، ملزم اور مقتول کے مابین جو بدمزگی ہوئی تھی، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ استغاثہ نے تو اس تفصیل کو ''شہ سرخیوں'' کے ساتھ حوالۂ عدالت کیا ہے۔ میری مصدقہ معلومات کے مطابق وہ ناپسندیدہ واقعہ شام چھ، سوا چھ بجے پیش آیا تھا، جب ملزم اور اس کے ساتھی ندیم کو ہوٹل سے نکالا گیا تو وہ خاصے برہم تھے۔ ندیم نے ملزم کو مشورہ دیا کہ وہ اس کے گھر چلے۔ اس طرح تھوڑی آؤٹنگ سے اس کا موڈ ٹھیک ہو جائے گا۔ ندیم اور ملزم سیدھے چاندنی چوک ملزم کے گھر پہنچے۔ ملزم نے اپنے گھر والوں کو بتایا کہ وہ ندیم کے ساتھ اس کے گھر جا رہا ہے اور واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے، لہٰذا وہ اس کے لئے پریشان نہ ہوں۔''

میں نے ایک مرتبہ پھر توقف کیا، حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی، پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ملزم اور اس کا دوست ندیم لگ بھگ سات بجے چاندنی چوک سے بورڈ آفس کی جانب روانہ ہوئے اور پھر رات بارہ بجے ندیم اپنی موٹر سائیکل پر ملزم کو اس کے گھر چھوڑنے کے لئے روانہ ہوا۔ ٹھیک سوا بارہ بجے ملزم اپنے گھر کے اندر موجود تھا اور ساڑھے بارہ بجے اسے پولیس نے سیٹھ منظور کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اس سے بڑی اندھیر نگری اور کیا ہو گی، جنابِ عالی؟''

میں نے آخری سوالیہ جملہ جج کی جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا، لیکن قبل اس کے کہ جج اپنی زبان کو کسی قسم کی حرکت دیتا، وکیل استغاثہ نے مجھ سے پوچھا۔

''یہ اوقات کی جمع تفریق تو وہ ہے، جو آپ کے مؤکل نے آپ کو بتائی ہو گی۔ وہ خود کو بچانے کے لئے غلط بیانی سے بھی تو کام لے سکتا ہے۔ ممکن ہے، وہ ندیم کے گھر سے گیارہ بجے نکل آیا ہو۔''

''اس امر کی گواہی کے لئے ندیم کو عدالت میں بلایا جا سکتا ہے۔'' میں نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "ندیم، ملزم کا گہرا دوست ہے۔ وہ اسے محفوظ کرنے کے لئے جھوٹی سچی جیسی بھی گواہی دینے کو تیار ہو جائے گا۔"

"میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں، میرے فاضل دوست!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "انسان کی نفسیات کے ایک پہلو کی رو سے ملزم خود کو بچانے اور اس کا دوست ملزم کو محفوظ رکھنے کے لئے دروغ گوئی سے کام لے سکتے ہیں، لیکن شاید آپ ندیم کے والد صاحب کو نہیں جانتے۔"

میں نے یہ سوال اتنا اچانک اور سادگی سے کیا تھا کہ وکیل استغاثہ بوکھلا کر رہ گیا، پھر ہڑبڑائے ہوئے لہجے میں اس نے پوچھا۔

"ندیم کے والد.......کو کیا.......ہوا ہے؟"

"انہیں کچھ بھی نہیں ہوا، وکیل صاحب!" میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "ندیم کے والد صاحب کا نام قاضی تمیزالدین ہے۔"

"قاضی تمیزالدین.......!" اس نے زیرِ لب دہرایا، پھر پوچھا۔ "کیا یہ وہی صاحب ہیں، جن کے نام پر ادھر ایک روڈ بھی ہے....... پی آئی ڈی سی کے پاس.......قاضی تمیزالدین روڈ.......؟"

"آپ بہت پیچھے چلے گئے ہیں، جناب!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "وہ مولوی تمیزالدین صاحب تھے۔ مگر میں قاضی تمیزالدین کی بات کر رہا ہوں۔ اتنا تو آپ کو معلوم ہونا ہی چاہئے کہ عمارتیں، سڑکیں اور پارکس وغیرہ عموماً ان لوگوں کے ناموں سے موسوم کئے جاتے ہیں، جو ہم سے رخصت ہو جاتے ہیں، تاکہ ان کی یاد اور یادگار زندہ رہے۔ اور پھر.......آپ نے تو اپنی وکالت ہی کو میری نظر میں مشکوک بنا دیا ہے کہ آپ کو معروف شخصیت مولوی تمیزالدین اور قاضی تمیزالدین کیس سے کوئی آگاہی نہیں؟"

وہ خجل سا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے چڑھائی جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میرے فاضل دوست! ندیم کے والد صاحب کا نام قاضی تمیزالدین ہے اور وہ صفِ اوّل کے مفتی شمار ہوتے ہیں۔ لوگ پیچیدہ اور اُلجھے ہوئے معاملات کے لئے ان کے پاس فتویٰ لینے آتے ہیں۔ وہ ادھر نارتھ کراچی کی مسجد میں روزانہ پانچ بجے سے

لے کر رات ساڑھے نو بجے تک موجود ہوتے ہیں اور دس بجے تک واپس اپنے گھر آ جاتے ہیں۔"

میں تھوڑی دیر کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"وقوعہ کی رات بھی وہ ٹھیک دس بجے گھر پہنچ گئے تھے۔ اس وقت ندیم اور ملزم گھر کے اندر موجود تھے۔ قاضی تمیزالدین اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ دونوں لڑکے رات بارہ بجے ہی، موٹر سائیکل پر سوار ہو کر وہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ اب آپ یہ اعتراض نہ جڑ دیجئے گا کہ قاضی تمیزالدین بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔"

وکیل استغاثہ کے غبارے کی ہوا نکل چکی تھی، لہٰذا وہ کوئی بھی معترض پوائنٹ نہ اٹھا سکا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بیگ صاحب! کیا آپ قاضی تمیزالدین صاحب کو اس امر کی گواہی کے لئے عدالت میں پیش کر سکتے ہیں کہ وقوعہ کی رات ملزم دس اور بارہ بجے کے درمیان ان کے گھر میں موجود تھا؟"

"بالکل.......کیوں نہیں جناب؟" میں نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ "سیٹھ منظور کے سوا میں ہر اس شخص کو عدالت میں پیش کر سکتا ہوں، جس کی شہادت سے میرا مؤکل باعزت بری ہو جائے۔"

جج نے نگاہ اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ عدالت کا مخصوص وقت ختم ہونے میں دو چار منٹ ہی باقی تھے۔ سارا وقت آئی۔ او پر ہونے والی جرح کھا گئی تھی۔ استغاثہ کے کسی گواہ کو کٹہرے میں آنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ لیکن میں آج کی کارروائی سے بے حد مطمئن تھا۔ میں نے اپنے دلائل کی مدد سے استغاثہ کی بنیاد ہلا کر کیس کو ایک خاص ڈگر پر ڈال دیا تھا۔ وہ ڈگر جو سیدھی میری کامیابی اور میرے مؤکل کی بریت کی طرف جاتی تھی۔ مجھے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ استغاثہ کے گواہ یا وکیل استغاثہ آگے چل کر کیا زور ماریں گے۔ میں نے اپنا کام تسلی بخش انداز میں کر دیا تھا اور مجھے پوری اُمید بھی تھی کہ قاضی تمیزالدین کی معتبر گواہی کے بعد عدالت میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم خلیل خان کو باعزت بری کر دے گی۔

جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو میرے ساتھ چلتے ہوئے شکیل خان نے متحیر لہجے میں کہا۔

"بیگ صاحب! مجھے تو بالکل یقین نہیں آ رہا۔"

"کس بات کا شکیل صاحب؟" میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

وہ ممنونیت کے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔

"آج اس کیس کی پہلی باقاعدہ پیشی تھی اور آپ نے تو پانسہ پلٹ کر رکھ دیا۔"

"اگر آپ کو یہ پلٹا ہوا پانسہ اچھا نہیں لگ رہا تو اسے الٹ دیتے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے مذاق کیا۔ "میں تو آپ کا وکیل ہوں........ جو حکم ہو!"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا، بیگ صاحب!" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

میں نے استفسار کیا۔ "پھر کیا مطلب تھا، آپ کا؟"

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"دراصل، میں نے تو سن رکھا ہے کہ وکیل حضرات مختلف حیلوں بہانوں سے کیس کو لمبا کرتے رہتے ہیں، تاکہ ان کی آمدنی کا در زیادہ عرصے کے لئے کھلا رہے۔ لیکن آپ تو ہر معاملے کی تلخیص کرنے پر تُلے نظر آتے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ قاضی تمیزالدین کی گواہی کے بعد تو عدالت خلیل خان کو بری کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔"

"شکیل صاحب!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ نے وکیلوں کے حوالے سے اپنی حسِ شنید کا تذکرہ کیا ہے، وہ سب پر فٹ نہیں بیٹھتی لہٰذا اسے فارمولا مت سمجھیں۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ہماری برادری میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے۔ یہ عموماً وہ وکیل ہوتے ہیں، جو کسی نہ کسی زاویے سے نالائق ہوں۔ یا تو ان کی پریکٹس بڑی ماٹھی ہوتی ہے۔ وہ مہینوں کلائنٹ کی راہ تکتے ہیں اور اگر ان کی خوش قسمتی اور کلائنٹ کی بدقسمتی سے کوئی ان کے چنگل میں آن پھنستا ہے تو پھر وہ اس کی جدائی کو برداشت نہیں کر پاتے۔ حالات و واقعات کسی بھی ڈگر پر جا رہے ہوں، وہ اپنے مؤکل کو فارغ کرنا پسند نہیں کرتے۔ بلکہ تاریک راہوں پر اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے......" میں سانس لینے کے لئے تھما، پھر وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جو مخالف پارٹی سے مل جاتے ہیں، ان سے بھاری بھاری رقمیں بٹورتے ہیں اور اپنے مؤکل کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے تاریخوں پر تاریخیں لیتے رہتے ہیں۔ یا پھر ایک گروپ وہ بھی ہے، جنہیں اپنی وکیلانہ صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں ہوتا اور وہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے مؤکل کی مٹی بھی خراب کرتے ہیں۔ اور جہاں تک قاضی تمیزالدین کا تعلق ہے......" میں نے ایک مرتبہ پھر لمحاتی توقف کیا اور پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے، شکیل صاحب! کہ قاضی صاحب کی گواہی اس کیس کا فیصلہ کر دے گی اور........ وہ بھی ہمارے حق میں۔"

"ویسے یہ قاضی صاحب، آپ خوب ڈھونڈ کر لائے ہیں۔" وہ پُرجوش انداز میں بولا۔

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں، شکیل صاحب!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہ ندیم کے والد محترم ہیں اور بطور گواہ بھی اسی کی دریافت ہیں۔ اس لڑکے نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اہم معلومات اکٹھا کر کے مجھے دی ہیں۔ یہ آپ کے بھائی کا سچا اور بے لوث دوست ہے۔"

"اللہ اس کی عمر دراز کرے۔" شکیل خان نے دعائیہ انداز میں کہا۔

"آمین!" میں نے بھی صدقِ دل سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ مجھ سے رخصت ہو گیا۔



عدالت کی کارروائی اپنے مقررہ وقت پر شروع ہوئی۔ اس روز پہلا کیس ہمارا ہی تھا۔ اس سے پہلے کہ استغاثہ کی جانب سے کوئی گواہ کٹہرے میں پہنچتا، جج نے اپنے چشمے کے اوپر سے مجھے دیکھا اور استفسار کیا۔

"بیگ صاحب! کیا صفائی کے گواہ قاضی تمیزالدین صاحب اس وقت عدالت میں موجود ہیں؟"

جج کی حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے مجھ سے بھی زیادہ دلچسپی

کہا۔

"جنابِ عالی! جیسا کہ معزز عدالت اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ آج کل شہر میں آشوبِ چشم نے ایک طوفان اٹھا رکھا ہے۔ شاید ہی ایسا کوئی شخص ہو، جس کی آنکھیں نہ دُکھنے آئی ہوں۔ میڈیکل اسٹورز سے آئی ڈراپس اور جنرل اسٹورز سے عرقِ گلاب کی شیشیاں غائب ہو چکی ہیں، لیکن یہ نامراد وبا کچھ اس نوعیت کی ہے کہ چاہے جتنا بھی علاج کرو، یہ ہفتہ دس دن سے پہلے تو جان چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ قاضی صاحب بھی اسی عفریت کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں۔"

میں نے سانس ہموار کرنے کے لئے توقف کیا تو جج نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"تو اس کا مطلب ہے، آج قاضی صاحب گواہی کے لئے حاضرِ عدالت نہیں ہو سکیں گے؟"

"ایسی بات نہیں ہے، جنابِ عالی! وہ آئیں گے اور ضرور آئیں گے، مگر....... تھوڑی تاخیر ہو جائے گی۔" میں نے اپنے لہجے میں ڈرامائی رنگ بھرتے ہوئے کہا۔

"آج ایک آئی اسپیشلسٹ سے صبح میں ان کا اپائنٹمنٹ تھا۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ ڈاکٹر سے فارغ ہوتے ہی وہ سیدھے عدالت میں آئیں گے۔ ان کی آمد گیارہ، ساڑھے گیارہ بجے تک متوقع ہے۔"

جج نے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وکیل صاحب! صفائی کے گواہ کی آمد میں ابھی کم از کم دو گھنٹے باقی ہیں، جب تک آپ اپنے کسی گواہ کو بھگتا لیں، تاکہ عدالتی کارروائی کا تسلسل برقرار اور جاری رہ سکے۔"

وکیل استغاثہ نے سر کو اثباتی جنبش دی اور اپنے ایک گواہ کو پیش کر دیا۔ استغاثہ کے اس گواہ کا نام مرزا ظہیر تھا۔ عمر لگ بھگ ساٹھ سال رہی ہو گی۔ چھریرا بدن، دراز قامت، سر کے بال گرے، کلین شیو، وضع قطع اور پہناوا انگریزوں جیسا۔ آپ اسے ایک دیسی انگریز سمجھ سکتے ہیں۔ میں نے ندیم کے توسط سے جہاں اس کیس کے مختلف

گواہوں کا کچا چٹھا بھی شامل تھا، جبھی میں اتنا مطمئن تھا کہ فتح بالآخر ہماری ہی ہو گی۔

مرزا ظہیر نے سچ بولنے کا حلف اُٹھایا اور اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ پھر جج کی اجازت حاصل کر کے وکیل استغاثہ جرح کے لئے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ اس نے گواہ پر نگاہ جماتے ہوئے خوشگوار لہجے میں استفسار کیا۔

"مرزا صاحب! وقوعہ کی شام جب مقتول سیٹھ منظور اور ملزم خلیل خان کے درمیان جھگڑا ہوا تو اس وقت آپ ہوٹل میں موجود تھے؟"

"جی ہاں، میں وہاں موجود تھا۔" گواہ نے سادگی سے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

"کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گے کہ ان لوگوں کے بیچ جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"

"بات تو بہت معمولی سی تھی، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے جھگڑا عروج پر پہنچ گیا۔" مرزا ظہیر نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلائی اور بولا۔ "اور......... میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سراسر قصور لڑکوں ہی کا تھا۔ آج کل کے جوانوں میں برداشت کا مادہ بالکل نہیں رہا۔ ذرا ذرا سی بات پر آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔ اور بزرگوں کا احترام تو شاید ان کے دل و دماغ سے اُٹھ ہی گیا ہے۔"

گواہ اپنے وکیل کا رٹایا ہوا سبق سنا رہا تھا۔ وکیل استغاثہ کی تسلی نہ ہوئی۔ اس نے پوچھا۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے، لیکن ابھی تک آپ نے تنازع کی وجہ نہیں بتائی؟"

"میں نے کہا نا، بہت معمولی سی بات تھی۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ان لوگوں کے سالن میں ایک مکھی نکل آئی تھی۔ انہوں نے سالن کی پلیٹ دیکھتے ہی شور مچانا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے ٹیبل مین نے معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ جب یہ صورتِ حال اُس کے قابو میں نہ رہی تو سیٹھ کو مداخلت کرنا پڑی۔ سیٹھ نے بیرے کو حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کو نیا سالن لا دے۔ لیکن وہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ لڑائی جھگڑے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلے ہوں۔ وہ سیٹھ کو اور اس کے ہوٹل کے کھانوں کو مسلسل لعن طعن کر رہے تھے۔ جب یہ صورتِ حال

برداشت سے باہر ہوگئی تو سیٹھ نے مجبوراً اپنے ملازمین کی مدد سے انہیں ہوٹل سے باہر نکال دیا۔"

بات مکمل کرنے کے بعد استغاثہ کا گواہ ہانپنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ میلوں دور سے اندھا دُھند دوڑتا ہوا آیا ہو۔ اس کے خاموش ہوتے ہی وکیل استغاثہ نے بڑے شاطرانہ انداز میں اگلا سوال داغ دیا۔

"اور.......سیٹھ منظور کا انتہائی مجبوری میں اٹھایا ہوا یہ قدم نوجوان نسل کے ان سپہ سالاروں کو پسند نہیں آیا تھا۔ انہیں اپنی بے عزتی کا بڑا ملال تھا اور وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے مقتول سیٹھ منظور کو خطرناک دھمکیاں بھی دی تھیں؟"

"جی ہاں، ایسا ہوا تھا۔ اور یہ کام صرف اس نوجوان نے کیا تھا۔" مرزا ظہیر نے ایکوزڈ باکس میں کھڑے ملزم خلیل خان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دوسرا بے چارہ تو خاموش کھڑا تھا، زیادہ جلال اسی کو آرہا تھا۔"

"اس نے اپنے جلال کا اظہار کن الفاظ میں کیا تھا؟" وکیل استغاثہ نے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

"اس نے بڑے واضح الفاظ میں سیٹھ منظور کو دھمکی دی تھی۔" مرزا ظہیر نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بتایا۔ "تم جو بھی کر رہے ہو، اپنے حق میں بہت برا کر رہے ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں کتنا خطرناک آدمی ہوں۔ جلد ہی تمہیں ایسا مزا چکھاؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔"

"اور اسی رات، فائرنگ کر کے سیٹھ منظور کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔" وکیل استغاثہ نے لاسٹ لائن اسٹوری کے مانند اپنی جرح کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"جی.......جی ہاں!" گواہ نے بڑی فرمانبرداری سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا، جنابِ عالی!" وکیل استغاثہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اگرچہ قتل ہونے والے کسی شخص کو اپنی زندگی کے آخری لمحات میں ملنے والی اس نوعیت کی سنگین دھمکی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے، لیکن دوسری جانب قاضی تمیز الدین کی گواہی کی شکل میں ملزم کو ایک بہت بڑی پناہ یا ڈھال حاصل تھی، لہٰذا استغاثہ میرے مؤکل کا ایک بال بھی بانکا نہیں کرسکتا تھا۔

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ چند لمحات تک میں کٹہرے میں کھڑے استغاثہ کے گواہ مسٹر مرزا ظہیر کو دیکھتا رہا، پھر اپنی معلومات کی روشنی میں، میں نے جرح کا آغاز کیا۔

"مسٹر ظہیر! آپ کو تو مقتول کے ہوٹل سے بڑی محبت تھی۔ دن کا بیشتر حصہ آپ وہیں پر گزارتے تھے۔ مقتول نے آپ کو خاص رعایت دے رکھی تھی، اور کوئی بھی ویٹر آپ کو ٹیبل پر سے اُٹھانے کی کوشش نہیں کرتا تھا، چاہے آپ کچھ کھا پی رہے ہوں، یا ایسے ہی خوانخواہ بیٹھے ہوں، اور......." میں نے لمحاتی توقف کیا، پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

".......اور آپ جب ایسے ہی خوانخواہ بھی بیٹھتے تھے تو کچھ نہ کچھ کرتے نظر آتے تھے۔ کبھی اخبار پڑھتے ہوئے، کبھی معمے اور پزل حل کرتے ہوئے، کبھی پرائز بانڈز کے آنکڑے ترتیب دیتے ہوئے اور کبھی چپ چاپ خلا میں گھورتے ہوئے....... میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں جناب!" اس نے میری بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "ایک عرصے سے میرے معمولات یہی تھے۔ میرے دو ہی ٹھکانے تھے۔ رات میں گھر اور دن میں ہوٹل۔ لیکن مقتول سیٹھ منظور کی موت کے بعد سے ہوٹل بند پڑا ہے اور میں خاصا ڈسٹرب ہوں۔ سمجھ میں نہیں آرہا......."

"آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، مسٹر ظہیر!" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "اس کیس کا فیصلہ ایک آدھ پیشی میں ہو جائے گا۔ اس کے بعد مقتول کا بیٹا مسرور، ہوٹل کو نئے سرے سے شروع کرے گا۔ مسرور صاحب اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہیں۔ میں ان سے درخواست کرتا ہوں کہ جب وہ اپنے مرحوم والد کے کاروبار کو شروع کریں تو مسٹر ظہیر کا خاص طور پر خیال رکھیں۔ ایسے گاہک ہوٹل کے نصیب میں نہیں ہوتے۔"

"تھینک یو، وکیل صاحب!" مرزا ظہیر نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مسٹر ظہیر! میری معلومات کے مطابق، ملزم بھی اکثر و بیشتر مقتول کے ہوٹل میں

کھانے پینے کے لئے بیٹھ جاتا تھا۔ خصوصاً جب اس کا دوست ندیم آیا ہوا ہوتا تو وہ دونوں گھنٹہ دو گھنٹہ ہوٹل میں گزارتے تھے۔ آپ چونکہ مذکورہ ہوٹل کے مستقل گاہک تھے، لہٰذا ملزم کو شکل وصورت سے اچھی طرح پہچانتے ہوں گے؟''

''جی ہاں........ جی ہاں........'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں نے ملزم کو متعدد بار ہوٹل میں بیٹھ کر کھاتے پیتے دیکھا تھا۔''

''وقوعہ کی شام کو چھوڑ کر........'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا کبھی ملزم کا مقتول کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا؟''

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''نہیں جناب! میں نے ایسا کوئی واقعہ کبھی رونما ہوتے نہیں دیکھا۔''

''ملزم نے کبھی ہوٹل کے عملے کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہو؟''

''نہیں........ بالکل نہیں۔''

''وہاں آنے والے کسی دوسرے گاہک کے ساتھ کوئی بدکلامی کی ہو؟''

''قطعی نہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملزم بنیادی طور پر طبعاً اور فطرتاً ایک امن پسند، صلح جو اور خوش اخلاق انسان ہے........ ہے نا؟''

''ہاں، ہاں........!'' میں نے مرزا ظہیر کو ایسے فریم میں فٹ کر دیا تھا کہ وہ میری رائے سے اختلاف کر ہی نہیں سکتا تھا، حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ''میری تو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نوجوان کو وقوعہ کی شام آخر ہو کیا گیا تھا۔''

''یہ حقیقت بہت جلد آپ کی سمجھ میں آ جائے گی، مسٹر ظہیر!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کبھی کبھی کسی بے اعتدالی پر جوان خون جوش مار ہی جاتا ہے۔ یہ جوانی........ دیوانی ہوتی ہے۔ آپ کی جوانی میں بھی ایسے ہی جوشیلے واقعات ہوئے ہوں گے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، وکیل صاحب!'' وہ جذبات سے بوجھل آواز میں بولا۔ ''ایک مرتبہ میں نے اپنے پڑوسی کے مالی کو مار مار کر لہولہان کر دیا تھا۔'' یوں محسوس ہوتا تھا، وہ اپنی جوانی کے دور میں پہنچ گیا ہو۔ ''ان دنوں الماس سے میرا عشق

چل رہا تھا، جو ہمارے پڑوس میں رہتی تھی اور وہ کم بخت مالی، الماس کے باپ کو میرے بارے میں اُلٹی سیدھی پٹیاں پڑھاتا رہتا تھا........''

''مسٹر ظہیر!'' میں نے اس کی لو اسٹوری کو بریک لگاتے ہوئے کہا۔ ''ملزم کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ آپ کے ماضی کی یاد سے قطعی مختلف ہے۔ یہاں نہ تو کوئی عشقیہ معاملہ تھا اور نہ ہی میرے مؤکل نے کسی کو مار مار کر لہولہان کیا تھا، بہرحال........ آپ نے بڑے معتبر انداز میں اس امر کی تصدیق کر دی ہے کہ ملزم کی مقتول کے ساتھ کوئی دیرینہ چپقلش یا دشمنی نہیں تھی اور وہ ایک با اخلاق اور شریف النفس انسان ہے، امن پسند و صلح جو........ آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔''

پھر میں نے جج کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا، جنابِ عالی!''

جج نے نگاہ اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا، کلاک دس، دس کا وقت بتا رہا تھا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بیگ صاحب! آپ کا گواہ قاضی تمیز الدین تو گیارہ اور ساڑھے گیارہ بجے کے درمیان آئے گا، کیوں نہ استغاثہ کے ایک اور گواہ کو نمٹا لیا جائے؟''

''بہت مناسب ہے، جنابِ عالی!'' میں نے فرماں برداری سے کہا۔

جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ''آپ کسی اور گواہ کو پیش کرنے کے لئے تیار ہیں؟''

''جنابِ عالی! آج استغاثہ کے دو گواہ عدالت میں حاضر ہوئے تھے۔'' وکیل استغاثہ نے جواب دیا۔ ''مرزا ظہیر اپنی گواہی مکمل کر کے عدالت کے کمرے سے باہر جا چکے ہیں، دوسرا گواہ مقتول کا باورچی ارشاد علی باہر موجود ہے۔''

میں نے بے ساختہ کہا۔

''استغاثہ کا سب سے اہم گواہ ارشاد علی........ جس کی آنکھوں کے سامنے اس کے مالک سیٹھ منظور کو قتل کیا گیا۔ سب سے پہلے تو اسی کو پیش کیا جانا چاہئے تھا!''

اِدھر میری بات ختم ہوئی، اُدھر جج نے وکیل استغاثہ کو حکم دیا۔

''آپ مسٹر ارشاد علی کو گواہی کے لئے اندر بلا لیں۔''

عدالت کے دستور اور اصول کے مطابق، ایک وقت میں صرف ایک ہی گواہ کو شہادت کے لئے کٹہرے میں بلایا جاتا ہے، تاکہ اس کے بیان اور جوابات سے دوسرے گواہوں کی شہادت متاثر نہ ہو۔ باقی جتنے بھی گواہ حاضر ہوں، انہیں عدالت کے کمرے سے باہر دوسری محفوظ جگہ پر بٹھایا جاتا ہے اور کارروائی اگر کسی عام سے کیس کی ہو تو مذکورہ گواہان عدالت کے برآمدے میں بچھی چوبی بینچوں پر بھی براجمان دکھائی دیتے ہیں۔

ارشاد علی کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور دُبلے پتلے جسم کا مالک ایک عام سی صورت والا شخص تھا۔ چہرہ قدرے لبوترا اور رنگت گندمی۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا، پھر اپنا بیان ریکارڈ کروا دیا۔ یہ بیان، اس سے پہلے پولیس کو دیئے گئے بیان کی فوٹو کاپی تھا۔ مجھے اس میں کوئی بھی نئی بات محسوس نہیں ہوئی۔ بس، جملوں، الفاظ اور واقعات کی ترتیب کے گھماؤ پھراؤ کے بعد یہ بالکل ویسا ہی بیان تھا۔

وکیل استغاثہ، جج کی اجازت حاصل کر کے گواہ والے کٹہرے کے پاس پہنچا، پھر مختلف نوعیت کے سوالات کے ذریعے وہ معزز عدالت کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ سیٹھ منظور کو میرے مؤکل کے سوا اور کسی نے قتل نہیں کیا۔ میں وکیل مخالف کے طریقۂ واردات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا، مگر مجھے اس سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ کیونکہ میں نے اپنا ہوم ورک مکمل کیا ہوا تھا۔

وکیل استغاثہ کا زیادہ زور ملزم کے کہے ہوئے الفاظ کی طرف تھا، جس میں ملزم نے مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی، وغیرہ وغیرہ...... میں صبر و سکون کے ساتھ وکیل استغاثہ کی ''محنت'' کا تماشا دیکھتا رہا۔ ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ وہ بعض سوالات کو خوامخواہ دہرا کر وقت برباد کر رہا تھا۔ وہ اس کوشش میں دکھائی دیتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ وقت وہ پی جائے اور میرے حصے میں چند لمحات ہی آئیں۔ یا پھر وہ قاضی تمیز الدین کی گواہی سے خائف تھا اور چاہتا تھا کہ آج کا دن ارشاد علی کے ساتھ ہی بیتایا جائے، قاضی صاحب کو بعد میں دیکھا جائے گا۔ ظاہر ہے، جس گواہ کی شہادت چل رہی تھی، جب تک اس پر جرح مکمل نہ ہو جاتی، دوسرے گواہ کو

پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر وکیل استغاثہ بے چارہ یہ نہیں جانتا تھا کہ میں اس کے گواہ کے ساتھ کون سا ہاتھ کرنے کا ارادہ کئے بیٹھا ہوں۔ میں دل ہی دل میں اس کی بے خبری پر مسکرا کر رہ گیا۔

خدا خدا کر کے اس نے گیارہ بجے گواہ کو فارغ کیا تو میں اپنا فرض نبھانے کے لئے وِٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ارشاد علی! تمہیں مقتول سیٹھ کے ہوٹل پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا تھا؟...... ہوا تھا...... میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میرے اعداد و شمار کے مطابق، آئندہ زندگی میں تمہیں کبھی وہاں کام کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا اور وہ بھی اس شرط پر کہ اگر زندگی سلامت رہی تو......''

میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ شکایتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! آپ تو خوامخواہ ڈرانے والی باتیں کر رہے ہیں۔''

''میں تو محض ڈرانے والی باتیں کر رہا ہوں، جب کہ تم ایسے کام کرتے ہوئے بھی نہیں ڈرتے۔''

میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بالکل سچ بتا رہا ہوں، ارشاد! اگر کل کلاں سیٹھ منظور کے بیٹے نے اس ہوٹل لائن کے بزنس کو جاری بھی رکھا تو وہ تمہیں کسی بھی قیمت پر اپنے ہوٹل میں قدم نہیں رکھنے دے گا۔ بہرحال......'' میں نے لمحاتی توقف کیا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تم مقتول کے پاس کب سے کام کر رہے تھے؟''

میری اس نوعیت کی جرح نے استغاثہ کے گواہ کو تو پریشان کیا ہی تھا، اس کے ساتھ ہی حاضرینِ عدالت بھی اُلجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے مجھے ہی دیکھ رہے تھے کہ پتہ نہیں، میں جرح کے تھیلے میں سے حقائق کی کون سی بلی برآمد کرنے والا ہوں۔ ارشاد علی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''پانچ سال سے۔''

''تمہاری رہائش ناگن چورنگی کے علاقے میں ہے۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہارا تعلق کراچی ہی سے ہے؟........ میرا مطلب ہے، کیا تم یہیں کی پیدائش ہو؟''

''نہیں جناب! میرا تعلق بہاول پور سے ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں آٹھ سال پہلے کراچی آیا تھا۔ باورچی گیری کا کام بھی میں نے اِدھر ہی سیکھا ہے۔ پہلے اِدھر اُدھر دو تین ہوٹلوں میں کام کیا، پھر سیٹھ منظور کے پاس آ گیا........ اور پچھلے پانچ سال سے میں اِدھر ہی کام کر رہا تھا۔''

''ویری گڈ!'' میں نے اس طرح مسکرا کر اسے دیکھا، جیسے بلی جھپٹا مارنے سے پہلے مسکرا کر معنی خیز انداز میں اپنے شکار کو دیکھتی ہے۔ ''تمہیں کافی عرصہ ہو گیا کراچی میں۔ اب تک تم نے اپنا ذاتی گھر تو بنا ہی لیا ہو گا؟''

''نہیں جناب! میں کرائے کے کوارٹر میں رہتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''اپنا گھر کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ سیٹھ اتنی زیادہ تنخواہ نہیں دیتا کہ بچت کر کے ذاتی گھر کا بندوبست کیا جا سکے۔''

''اوہ........!'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں سانس خارج کی، پھر پوچھا۔ ''مقتول تمہیں کتنی تنخواہ دے رہا تھا؟''

''صرف آٹھ سو روپے۔'' اس نے جواب دیا۔

آٹھ سو روپے ماہانہ اُجرت کوئی بہت بڑی رقم نہیں تھی، لیکن آج سے لگ بھگ چالیس سال پہلے اسے معمولی تنخواہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔

''ارشاد علی! تو اس کا مطلب ہے کہ تم جب سے کراچی میں ہو، کرائے کے کوارٹر ہی میں زندگی بسر کر رہے ہو۔ نہ تو تم ذاتی گھر خرید سکے اور نہ ہی کوئی پلاٹ یا فلیٹ وغیرہ بک کروایا؟''

''بالکل نہیں جناب!'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''فلیٹ یا گھر تو میرا خواب ہے، جو لگتا ہے........ کبھی نہیں پورا ہو گا!''

''امید پر دنیا قائم ہے، ارشاد علی!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''سمجھو کہ تمہارا خواب بھی پورا ہونے ہی والا ہے۔''

''جج...... جی......'' وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، پھر مجھ سے مستفسر ہوا۔

''مم...... میں سمجھا نہیں........ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''میں نے تو صرف یہ کہا ہے کہ یہ دنیا امید پر قائم ہے۔'' میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''جو خواب آج پورا ہوتا ہوا نظر نہیں آ رہا، وہ کل پورا بھی ہو سکتا ہے، اس لئے........ تمہیں دل چھوٹا اور دماغ موٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''اچھ........ چھا........ اچھا جی........!'' وہ گڑبڑا کر بولا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے، استغاثہ کے گواہ کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔

''ارشاد علی! وقوعہ کی رات تم اور مقتول سیٹھ منظور ہوٹل بند کر کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ سیٹھ تمہیں ناگن چورنگی پر ڈراپ کر کے معمول کے مطابق، اپنے گھر کی جانب روانہ ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن اس رات یہ معمول برقرار نہ رہ سکا۔ تمہارے سیٹھ کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور تم ایک مشکل میں پھنس گئے........ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی ہاں، بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

میں نے پوچھا۔

''وقوعہ کے روز مقتول نے کس قسم کا لباس پہن رکھا تھا؟''

''نیلے رنگ کا شلوار قمیض اور کالی واسکٹ۔''

''یہ وہی کالی واسکٹ ہے نا، جس کی اندرونی جیب میں مقتول نے کم و بیش پانچ ہزار روپے رکھے ہوئے تھے؟'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اسے دیکھا۔ ''سیٹھ کو قتل کرنے کے بعد حملہ آور اس کی جیب میں سے یہ رقم بھی نکال لے گیا تھا........ اور یہ تمام تر افسوس ناک واقعہ تمہاری نظروں کے سامنے پیش آیا تھا۔ ہے نا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔

''اور تم نے کیسا لباس پہنا ہوا تھا؟''

''کتھئی شلوار اور قمیض۔''

''ملزم کا لباس بھی تمہیں اچھی طرح یاد ہو گا؟''

اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ ان لمحات میں وہ مجھے خاصا متذبذب دکھائی دیا۔ میں نے ابرو چڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ واردات تمہاری آنکھوں کے سامنے پیش آئی تھی۔ ٹھیک ہے، ملزم نے اپنے چہرے پر ڈھاٹا لگا رکھا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس نے اپنے پورے بدن کو ڈھاٹے میں چھپایا ہوا ہو۔ تمہیں ملزم کے لباس کے بارے میں بتانے کے لئے اتنی سوچ بچار کی تو ضرورت نہیں ہے۔"

"جی........ مجھے یاد آ گیا۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔ "ملزم اس وقت نیلی پتلون اور شرٹ پہنے ہوئے تھا۔"

"پکا، نا؟" میں نے اسے نائیلون کی ڈوری سے باندھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ نہ ہو کہ تھوڑی دیر بعد تمہیں کچھ اور یاد آ جائے؟"

"نہیں جناب!........ مجھے اچھی طرح یاد ہے، واردات کے وقت ملزم نے نیلی پتلون اور سرخ شرٹ پہن رکھی تھی۔"

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

"جنابِ عالی! جس لباس کا تذکرہ استغاثہ کے گواہ ارشاد علی نے کیا ہے، وہ میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم خلیل خان نے اس وقت پہنا ہوا تھا، جب وہ وقوعہ کی شام اپنے دوست ندیم کے ہمراہ مقتول کے ہوٹل میں کھانے پینے کے ارادے سے آیا تھا۔ لیکن جب ندیم کے ساتھ اس کا بورڈ آفس جانے کا پروگرام بن گیا تو اس نے گھر جا کر اپنی روانگی کی اطلاع دینے کے علاوہ لباس بھی تبدیل کر لیا تھا اور یہ نیا لباس سفید شلوار قمیض اور سیاہ سویٹر پر مشتمل تھا، جس کی گواہی ملزم کے گھر والے، ندیم اور ندیم کے والد قاضی تمیزالدین دے سکتے ہیں۔ ملزم اسی لباس میں ندیم کے گھر میں موجود رہا اور انہی کپڑوں میں واپس آیا تھا۔"

"لیکن ارشاد علی کو اتنا بڑا مشاہداتی دھوکا کیسے ہو سکتا ہے؟" جج نے مجھ سے دریافت کیا۔

"جنابِ عالی! گواہ کو کوئی دھوکا نہیں ہوا۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وقوعہ کے روز جب ملزم اور اس کے دوست ندیم کو زبردستی ہوٹل سے

نکالا گیا تو اس کے بعد سے گواہ نے ملزم کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ میرے مؤکل کو قربانی کا بکرا بنانے کے لئے کاسٹیوم کا پرانا ورژن استعمال کر رہا ہے۔"

"لیکن کیوں؟........ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟" جج کے استفسار میں دلچسپی کے ساتھ ہی بے حد اصرار بھی شامل ہو گیا تھا۔ "ارشاد کی ملزم سے کیا دشمنی ہے؟"

"ملزم اور اس کے بڑے بھائی شکیل خان سے پولیس کی دشمنی کی تفصیل تو میں معزز عدالت کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ استغاثہ کے گواہ ارشاد علی نے جیسے ہی خلیل خان کا نام پیش کیا، ان کی عید ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں، زبان اور دماغ کو زحمت دیئے بغیر انہوں نے ملزم کو مجرم سمجھ لیا۔ اب استغاثہ کے گواہ ارشاد علی سے بھی پوچھ لیتا ہوں کہ میرے مؤکل نے اس کے خاندان کے کتنے افراد کو ماضی میں قربانی کے بکرے بنایا تھا؟"

میں ایک مرتبہ پھر گواہ کی جانب متوجہ ہوا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

ندیم کی فراہم کردہ معلومات کو استعمال کرنے کا اس سے زیادہ مناسب موقع اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ اس نوجوان نے حقِ دوستی بڑے شاندار طریقے سے ادا کیا تھا۔

"ارشاد علی! تم گزشتہ آٹھ سال سے کراچی میں مقیم ہو۔ سہراب گوٹھ کا نام تو تم نے سن رکھا ہو گا؟"

"جی ہاں........ میں وہاں ایک دو مرتبہ گیا بھی ہوں۔"

"سہراب گوٹھ میں، مین روڈ پر "مکہ بلڈرز" ہے۔" میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ "کبھی وہاں جانے کا اتفاق ہوا؟"

"جج........ جی نہیں........" وہ بدکا۔ "میں کسی مکہ بلڈرز سے واقف نہیں ہوں۔"

میں نے چوہے بلی کا کھیل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ارشاد علی! میں نے سنا ہے کہ پچھلے دنوں تمہارا کوئی پرائز بانڈ لگا تھا؟"

"جناب! میری قسمت ایسی کہاں؟" وہ مایوسی سے بولا۔

"پھر کوئی بی سی (کمیٹی) نکلی ہو گی........؟"

"میں نے کبھی کمیٹی ڈالی ہی نہیں تو نکلے گی کہاں سے؟" وہ یاسیت بھرے لہجے

میں بولا۔

’’اس کا مطلب ہے، کبھی کوئی بڑی رقم تمہاری جیب میں نہیں آئی۔‘‘ میں نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔’’اتنی رقم جس سے جیب بھر جائے۔‘‘

وہ بولا۔

’’وکیل صاحب! غریب آدمی کے لئے سب سے بڑی رقم اس کی تنخواہ ہوتی ہے۔ سیٹھ مہینے کے شروع میں جب مجھے تنخواہ دیتا تو میری جیب بھر جاتی تھی، لیکن آٹھ سو روپے کی رقم کو بڑی رقم تو نہیں کہا جا سکتا نا.......؟‘‘

’’بالکل درست!‘‘ میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ پھر اس سے پوچھا۔’’ارشاد علی! کبھی گلزارِ ہجری جانے کا اتفاق ہوا ہے؟‘‘

’’نہیں جناب! یہ نام میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے۔‘‘ وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرا، اپنی ہی دُھن میں پوچھتا چلا گیا۔

’’وہاں ایک بہت بڑی رہائشی اسکیم کے لئے فلیٹس کی بکنگ ہو رہی ہے؟‘‘

’’مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔‘‘ وہ خاصا نروس ہو رہا تھا۔

’’اس پروجیکٹ کی بکنگ مکہ بلڈرز والے کر رہے ہیں؟‘‘

’’جناب! میں نے کہا ہے نا.......‘‘ وہ ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا۔’’میں مکہ بلڈرز اور گلزارِ ہجری کی کسی رہائشی اسکیم سے واقف نہیں ہوں۔ آپ خوامخواہ یہ سوالات مجھ سے کیوں کر رہے ہیں؟‘‘

’’اس لئے کہ.......‘‘ میرے لہجے میں سختی در آئی۔’’گیارہ فروری کو مکہ بلڈرز نے گلزارِ ہجری کے فلیٹ نمبر بی۔ بارہ کی بکنگ پانچ ہزار روپے سے کی ہے اور بکنگ کرانے والا کوئی اور نہیں بلکہ تم....... ارشاد علی ہو....... تم معزز عدالت کو بتاؤ کہ تمہارے پاس وہ پانچ ہزار روپے کی رقم کہاں سے آئی تھی؟‘‘

’’مم....... میں نے کسی کو قتل....... مم....... میرا مطلب ہے....... میرے پاس رقم....... مم....... میں کیوں بتاؤں....... آپ کون ہوتے ہیں....... پوچھنے والے....... میں.......!‘‘

وہ اپنے بے ربط جملوں کو ادھورا چھوڑ کر کٹہرے سے باہر نکل آیا۔ انداز ایسا ہی تھا

کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہوگا۔ وہ بڑے جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھا بھی۔ میں یک دم محتاط اور ڈیفینسیو ہو گیا۔ لیکن اس نے مجھ پر اٹیک نہیں کیا، بلکہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے تیزی سے عدالت کے دروازے کی جانب بڑھا۔

میں نے انکوائری آفیسر کی جانب ہاتھ اٹھا کر با آوازِ بلند یہ نعرہ لگایا۔

’’پکڑو....... جانے نہ پائے....... اسی نے اپنے سیٹھ منظور کی جان لی ہے۔‘‘

انکوائری آفیسر اور مخصوص عدالتی عملہ بڑی سرعت سے حرکت میں آیا۔ عدالت کے کمرے میں سے کسی شخص کا یوں دُم دبا کر بھاگ نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ پلک جھپکتے میں ارشاد علی کو گرفتار کر لیا گیا۔

●.......●.......●

آئندہ پیشی پر میرے مؤکل کو باعزت بری کر دیا گیا۔

پچھلی پیشی کے اختتامی لمحات بڑے سنسنی خیز، انکشاف انگیز اور حیرت آمیز رہے تھے۔ میری کڑی جرح کے جواب میں استغاثہ کے گواہ مسٹر ارشاد علی کے جرم کا غبارہ ایک دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ ادھر اُس کی گرفتاری عمل میں آئی، اُدھر چپڑاسی نے کمرے میں آ کر بتایا کہ قاضی تمیزالدین صاحب باہر موجود ہیں۔ قاضی صاحب کو فوراً گواہی کے لئے اندر بلا لیا گیا۔

چند لمحات قبل عدالت کے کمرے میں جو کچھ پیش آ چکا تھا، اس کے بعد قاضی تمیزالدین کی گواہی محض خانہ پُری کی حیثیت کی حامل ثابت ہوئی۔ بہر حال، جج نے عدالتی کارروائی مکمل کرنے کے بعد فیصلے کے لئے تین روز بعد کی تاریخ دے دی تھی۔

پھر آج میرے مؤکل کے حق میں فیصلہ سنا دیا گیا۔

خلیل خان کی باعزت بریت کی سب سے زیادہ خوشی اس کے بڑے بھائی شکیل خان کو ہوئی تھی۔ اس نے فیصلے کے روز مجھ سے کہا۔

’’بیگ صاحب! آپ نے تو کمال کر دیا۔‘‘

’’میں نے جو بھی کیا ہے، اسے ندیم کی بھاگ دوڑ اور کوشش سے کمال حاصل ہوا ہے۔‘‘ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔’’میں اپنی تگ و دو سے اپنے مؤکل کو با آسانی بے گناہ ثابت کر سکتا تھا، لیکن ندیم کی فراہم کردہ معلومات نے تو اصل مجرم کو بھی

بے نقاب کر دیا۔''

''ندیم اور اس کے والد تمیز الدین کا تو میں جتنا بھی شکریہ ادا کروں، کم ہے۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''مگر آپ نے خلیل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے جو کچھ کیا، وہ قابلِ تحسین اور ناقابلِ فراموش ہے۔ اگر آپ جیسے درجن، دو درجن افراد اس ملک میں اور نمایاں ہو جائیں تو مجھے اُمید ہے، یہ ملک انسانوں کے رہنے کے لئے ایک مثالی دھرتی ثابت ہوگا۔'' وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شکیل صاحب! بات درجن، دو درجن یا ہزار کی نہیں بلکہ فرض شناسی اور احساسِ ذمے داری کی ہے۔ اگر ہمارے ملک کے عوام ان نکات کو سمجھ لیں تو کسی کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی........ یہ ملک خود بہ خود یوٹوپیا بن جائے گا۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ خیالوں میں کھو گیا۔ ''مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے پولیس والوں کے دانت کھٹے کر دیئے!''

''اس میں زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں، شکیل صاحب!''

''جی........ کیا مطلب؟'' وہ اُلجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔

''اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ دانتوں سے کھاتے ہیں اور دانت کھٹے ہو جانے کے بعد کھانا چھوڑ دیں گے تو آپ کا خیال غلط ہے، شکیل صاحب!''

''پھر؟'' اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔

''میں اس شہر کے دو ایسے پولیس آفیسرز کو ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ جن کے منہ میں ایک بھی دانت نہیں۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''لیکن وہ کھانے کے معاملے میں پورے ڈیپارٹمنٹ میں مشہور ہیں........ اور کھا کھا کر سرکاری سانڈ بنے ہوئے ہیں۔''

وہ بے ساختہ مسکرانے لگا۔ میں نے کندھے اچکا دیئے۔

●......●......●

سنگین مذاق

اُس کا سوال بڑا عجیب و غریب اور چونکا دینے والا تھا!

وہ میرے چیمبر میں داخل ہوئی تو میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ اس نے بیٹھنے کے لئے ایک کرسی کھینچ لی اور رسمی علیک سلیک کے بعد بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔

''بیگ صاحب! کیا آپ کی شادی ہو گئی ہے؟''

یہ سوال اتنا غیر متوقع اور خلافِ معمول تھا کہ میں اُلجھن زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ میری اس حالت پر زیرِ لب مسکرانے لگی۔ اُس کے ردِعمل نے مجھے متذبذب کر دیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے قدرے خشک لہجے میں استفسار کیا۔

''خاتون! پہلے تو یہ بتائیں، آپ کون ہیں؟ مجھے اتنی بے تکلفی سے ''بیگ صاحب'' کہہ کر مخاطب کیوں کر رہی ہیں؟........ اور یہ کہ آپ کو میری شادی کی اتنی فکر کیوں لگی ہوئی ہے؟''

''جرح شروع ہو گئی۔''

وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟''

آخری جملہ اس نے کچھ ایسے انداز میں ادا کیا تھا، جیسے مجھ سے ناشناسی کا شکوہ کر رہی ہو۔ میں نے بڑی گہری نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا، تاکہ یہ یاد کر سکوں کہ وہ کون تھی اور مجھے کس حوالے سے جانتی تھی۔ لیکن باوجود کوشش کے مجھے ...

کہ میں نے اسے کہاں دیکھا تھا۔

''معاف کیجئے گا، خاتون!'' میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔''میں آپ کو واقعی نہیں پہچان سکا۔''

''چلیں کوئی بات نہیں۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔''میں آپ کی اس ادا کو مائنڈ نہیں کروں گی۔''

میں منتظر نظروں سے اسے دیکھنے لگا کہ وہ اپنا مدعا بیان کرے۔ اس نے کچھ بیان کرنے کے بجائے اُلٹا مجھ ہی سے پوچھ لیا۔

''اچھا، یہ بتائیں کہ اگر میں آپ کے تمام سوالات کے جوابات دے دوں تو کیا پھر آپ بھی میرے سوال کا سیدھا اور سچا جواب دیں گے نا؟''

اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا حاکمانہ پن جھلکتا تھا۔ میں نے اس کے جارحانہ رویے کو نظرانداز کرتے ہوئے، بلی کو تھیلے سے باہر لانے کی غرض سے کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے۔''

وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی، پھر بتانے لگی۔''بیگ صاحب! آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں فرحانہ ہوں۔ دوسرے سوال کا جواب کچھ اس طرح سے ہے کہ بے تکلفی سے مخاطب کرنا میرا اسٹائل ہے اور میں اس میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتی۔ تیسرے سوال کے جواب میں سچی اور کھری کہوں گی کہ آپ مجھے جانتے ہیں اور نہ ہی میں آپ کو......وہ دراصل، میں نے آپ کے دفتر کے باہر لگی نیم پلیٹ پڑھ لی تھی، سو مجھے پتہ چل گیا کہ آپ ایک تجربہ کار اور کامیاب وکیل، مرزا امجد بیگ ہیں اور...... جہاں تک آخری سوال کا تعلق ہے کہ مجھے آپ کی شادی کی اتنی فکر کیوں لگی ہوئی ہے تو میں اس کے جواب میں یہی کہوں گی کہ صرف آپ ہی کی نہیں، بلکہ مجھے ہر اس شخص کی شادی کی فکر لگی ہوئی ہے، جو ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔''

میرے اندازے کے مطابق، فرحانہ کی عمر تیس اور پینتیس سال کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ ایک پُرکشش، اسمارٹ اور جاذب نظر خاتون تھی۔ خاصی فارورڈ اور بے تکلف بھی نظر آتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی باتونی بھی۔ مجھے وہ اپنی باتوں سے تھوڑی کھسکی ہوئی محسوس ہوئی۔ آج تک اس اسٹائل کی کسی عورت سے میرا واسطہ نہیں پڑا

تھا۔ یہ میرے لئے ایک نیا اور سنسنی خیز تجربہ تھا۔

مجھے خاموش اور متذبذب دیکھ کر اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

''بیگ صاحب! میں نے آپ کی فرمائش پوری کر دی۔ اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں۔''

''کون سا وعدہ؟'' بے اختیار میری زبان سے پھسل گیا۔

''کمال ہے......اتنی جلدی بھول گئے۔'' وہ کسی محبوبہ کے مانند آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی۔''یہ تو سراسر چیٹنگ ہے، بیگ صاحب!''

میں اُلجھ کر رہ گیا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟......میں نے کون سی چیٹنگ کی ہے؟''

''دیکھیں بیگ صاحب!''

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی اپنائیت سے بولی۔ میں نے اس کی فرمائش کو عملی جامہ پہنا دیا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔

''آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ کے تمام سوالات کے جوابات دے دوں تو پھر مجھے بتائیں گے کہ آپ کی شادی ہوگئی......کہ نہیں۔''

''اوہ......!'' میں نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا اور کہا۔

''تو آپ اس وعدے کی بات کر رہی ہیں۔''

''ہاں۔'' اس نے کسی دلربا کی طرح سر کو اثباتی جنبش دی اور بولی۔''اگر اتفاق سے کیا ہوا وعدہ یاد آ ہی گیا ہے تو جلدی سے اسے پورا بھی کر دیں......ویسے میں ایک بات کہنے سے باز نہیں آؤں گی۔''

''کون سی، فرحانہ صاحبہ؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

اس نے جواب دیا۔

''ایک کامیاب وکیل کی یادداشت، خاص طور پر شارٹ ٹرم میموری کو اتنا کمزور نہیں ہونا چاہئے۔ آپ کاغذی پلندوں کے ساتھ سر کھپاتے ہیں نا......اس لئے آپ کو نہایت ہی پابندی کے ساتھ کاغذی بادام استعمال کرنا چاہئیں۔''

''آپ کے اس مشورے کا بہت شکریہ۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ بے تکلفی کے گراف کو بلند کرتے ہوئے بولی۔

''اب میرے سوال کا جواب بھی دے دیں۔''

''بدقسمتی سے میں ابھی تک غیر شادی شدہ ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''آپ بہت ظالم ہیں۔'' وہ اپنے دونوں گالوں کو تھپ تھپاتے ہوئے بولی۔ ''اپنی خوش قسمتی کو بدقسمتی کہہ رہے ہیں........فوراً توبہ کریں۔''

میں توبہ تو کیا کرتا، البتہ اس سے پوچھ لیا۔

''تو آپ کی نظر میں غیر شادی شدہ شخص بڑا قسمت والا ہوتا ہے۔ کہیں آپ کا تعلق کسی شادی دفتر وغیرہ سے تو نہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''لیکن اگر کہیں تو آپ کی خاطر میں شادی دفتر بھی کھول سکتی ہوں۔''

''میری خاطر.... مجھ پر اتنی مہربانی کیوں؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس نے بڑی بھرپور نظروں سے مجھے دیکھا، لیکن میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ اتنی جاذبیت سے مجھے دیکھ رہی تھی کہ مجبوراً مجھے اس کے چہرے سے نگاہ ہٹانا پڑی۔

میری اس نظراتی پسپائی پر وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ اُس کے اس انداز میں خاصی خطرناکی چھپی ہوئی تھی۔ میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میری اس کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے وہ بڑے تشویش بھرے انداز میں اپنی رسٹ واچ کو دیکھنے لگی۔

''اوہ........میں تو بھول ہی گئی۔'' وہ متاسفانہ لہجے میں بولی۔ ''مجھے ایک جگہ بہت ہی ضروری کام سے جانا تھا۔ آپ کی صحبت میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔''

آخری جملہ اس نے بڑی لگاوٹ سے ادا کیا اور اُٹھ کر کھڑی ہوگئی، پھر متلاشی انداز میں اپنے پرس کو کھکھوڑنے لگی۔ اس کی پے درپے، غیر متوقع اور بے ربط حرکات نے مجھے ذہنی اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ میں نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں پوچھا۔

''فرحانہ صاحبہ! آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ میرے پاس کس کام سے آئی تھیں؟''

''میرا کام ہوگیا۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی۔ ''اب میں چلوں گی۔''

مجھ سے بات کرتے ہوئے وہ اپنے پرس کے ساتھ بھی مصروف رہی تھی۔ میری اُلجھن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ میں نے اُکتاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

''کام ہوگیا........کیا مطلب؟''

وہ ایک ایک جھٹکے سے گردن اُٹھا کر مجھے دیکھنے لگی۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی۔ اُس کی مسکراہٹ اتنی خطرناک تھی کہ مجھے اپنے وجود میں ایک سنسنی خیز لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ غیر ارادی طور پر میں نے نگاہ چرالی۔ اسی لمحے فرحانہ کی دلنشیں آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''بیگ صاحب! یہ میرا وزیٹنگ کارڈ رکھ لیں۔''

میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس کے ہاتھ میں وزیٹنگ کارڈ نظر آیا۔ یقیناً وہ اپنے پرس میں اسی کارڈ کو تلاش کر رہی تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے مذکورہ وزیٹنگ کارڈ لے لیا اور بغیر دیکھے اسے اپنی میز پر رکھ لیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر مسکرائی اور اپنائیت بھرے لہجے میں بولی۔

''آپ مجھ سے اس وزٹ کی فیس تو نہیں لیں گے؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''خاتون! میں........''

''خاتون نہیں........فرحانہ!'' اس نے تحکمانہ انداز میں میری بات کاٹ دی۔

اُس کی یہ حرکت بدتمیزی کے زمرے میں آتی تھی، تاہم اس نوعیت کی حرکات کے سلسلے میں خوب صورت عورتوں کے لئے دل میں گنجائش رکھنا مرد کی فطرت کا تقاضا ہے۔ میں نے بھی اس کی قطع کلامی کا برا منائے بغیر جلدی سے کہا۔

''او کے........فرحانہ صاحبہ! میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میں ایک پریکٹیکل آدمی ہوں اور اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ فیس میں صرف انہی لوگوں سے وصول کرتا ہوں، جن کا مجھے کام کرنا ہوتا ہے۔ آپ نے تو ابھی تک کام ہی نہیں بتایا، پھر فیس کس بات کی؟''

''میں تو سمجھتی ہوں، میں جس کام سے یہاں آئی تھی، وہ ہوگیا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اینی ہاؤ، اس وقت میں ذرا جلدی میں ہوں۔ اِن شاء اللہ! جلد

ہی دوبارہ ملاقات ہوگی۔"

"اِن شاء اللہ!" میں نے بے ساختہ کہا اور اسے رخصت کرنے کے لئے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اس نے بڑی بھرپور اور معنی خیز نگاہ سے مجھے دیکھا، ذومعنی انداز میں مسکرائی اور بڑی ادا سے پرس اٹھا کر مجھے "خدا حافظ" کہا، پھر دلکش چال کے ساتھ میرے چیمبر سے نکل گئی۔

میں اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس عجیب وغریب عورت........ میرا مطلب ہے، فرحانہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں فرحانہ کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے قاصر رہا تھا۔ اس نوعیت کی کلائنٹ پہلی مرتبہ میرے تجربے میں آئی تھی۔ وہ ایک خوب صورت، دلکش اور بڑی بھرپور عورت تھی۔

میں نے میز پر سے اس کا وزیٹنگ کارڈ اٹھا لیا، تاکہ اس سے تعارف حاصل کر سکوں۔ ابھی تک میں صرف اس کے نام ہی سے واقف تھا اور وہ بھی اسی نے بتایا تھا۔ مجھے اس سے سوال کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ وہ خوشبو کے ایک جھونکے کے مانند میرے چیمبر میں آئی تھی اور اس کے در و دیوار کو مہکا کر چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہاں کی فضا بڑی خوشگوار اور معطر تھی۔

وزیٹنگ کارڈ کے مطابق، اس کا نام فرحانہ ناز تھا۔ میرے خیال میں اس کا نام سراپا ناز ہونا چاہئے تھا۔ فرحانہ کی طرح اس کا وزیٹنگ کارڈ بھی بڑا پراسرار اور معنی خیز تھا۔ کارڈ پر اس کے نام کے علاوہ صرف ایک فون نمبر پرنٹ تھا، جو کراچی کے ایک پوش ایریا کی نشاندہی کرتا تھا۔ میں اس کارڈ کو اپنی انگلیوں میں گھماتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میرے پاس آنے والے لوگ عموماً مجھ سے وزیٹنگ کارڈ کی فرمائش کرتے تھے اور بہت ہی کم ایسے ہوں گے، جو مجھے اپنا کارڈ دے کر جاتے ہوں، لیکن فرحانہ ان سب سے بالکل مختلف، نرالی اور انوکھی تھی۔ فرحانہ سے زیادہ اس کا سوال دلچسپ اور سنسنی خیز تھا، جو اس نے میرے بارے میں پوچھا تھا۔

وہ جس انداز میں وزیٹنگ کارڈ مجھے تھما کر رخصت ہوئی تھی، اس سے یہی مطلب

نکلتا تھا کہ وہ چاہتی ہے، میں اس سے ٹیلی فونک رابطہ کروں اور یہ سرِدست میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ اس ناممکن کی کئی ایک وجوہات تھیں۔

نمبر ایک، اس وقت میں اپنے چیمبر میں بیٹھا تھا اور باہر وزیٹنگ لابی میں نصف درجن سے زیادہ افراد میرے انتظار میں اپنی باری کے لئے سوکھ رہے تھے۔ "سوکھ رہے تھے" میں نے محاورتاً کہا ہے، ورنہ وہ لوگ دھوپ میں نہیں بلکہ ٹھنڈے ٹھار ایئر کنڈیشنڈ ماحول میں بیٹھے تھے۔ وہ سوکھ تو نہیں، البتہ ان میں سے بعض کم برداشت والے سکڑ ضرور سکتے تھے........ میں اپنے ان نصف درجن کرم فرماؤں کو نظرانداز کر کے کسی اور مہم میں فی الحال مصروف ہونا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

نمبر دو، اس زمانے میں ہمارے ملک میں کسی نے سیل فون کا نام تک نہیں سنا تھا، استعمال کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ لٰہذا میں فوری طور پر فرحانہ سے رابطہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کے وزیٹنگ کارڈ پر لینڈ لائن کا نمبر تھا اور یقیناً وہ اپنی "لینڈ" سے ابھی کافی فاصلے پر تھی۔ میں اسے ابھی اور اسی وقت رِنگ کرتا تو ظاہر ہے، یا تو فون اٹینڈ ہی نہ ہوتا اور یا پھر اٹینڈ کرنے والا فرحانہ کے علاوہ کوئی اور ہوتا۔

میں فرحانہ اور اس کے وزیٹنگ کارڈ کو فی الوقت نظرانداز کر کے اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں میں مصروف ہوگیا۔

میری سیکرٹری نے اس کے بعد ترتیب وار ایک اور خاتون کو میرے پاس بھیج دیا۔ میرے کلائنٹس میں خواتین وحضرات کی تعداد تقریباً برابر ہی ہوا کرتی تھی، لیکن اس روز یہ حسین اتفاق تھا کہ پے درپے یہ تیسری خاتون میرے چیمبر میں داخل ہوئی تھی۔ پہلی خاتون جائیداد کی تقسیم کے سلسلے میں آئی تھی، دوسری یعنی فرحانہ دلنشیں مسکراہٹیں اُچھال کر چلی گئی تھی۔ میں اس کی آمد و جامد کو ابھی تک سمجھ نہیں پایا تھا اور اب یہ تیسری خاتون پتہ نہیں، کس سلسلے میں آئی تھی۔

میں نے حسبِ معمول اور حسبِ ضرورت پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لئے کرسی کی جانب اشارہ کر دیا۔ وہ نشست سنبھالنے کے بعد اُمید بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھ لیا۔

”جی فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

ایک لمحے کے تامل کے بعد وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میرا نام ہما ہے۔ میری ایک رشتے دار نے آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ اس لئے یہاں آ گئی۔ مجھے آپ سے قانونی مدد چاہیئے۔“

میں نے رف پیڈ اور پین سنبھال لیا، پھر اپنے سامنے بیٹھی ہما نامی اس باوقار خاتون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں یہاں اسی مقصد کے لئے بیٹھا ہوں۔ فرمائیں، آپ مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتی ہیں؟ مطلب........ آپ کو کون سا قانونی مسئلہ درپیش ہے؟“

”مسئلہ میرے شوہر کا ہے۔“ وہ غم زدہ لہجے میں بولی۔

میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ”آپ کے شوہر کو کیا ہوا ہے؟“

”وسیم کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔“

”کس الزام میں؟“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”اس پر قتل کا الزام عائد کیا جا رہا ہے۔“ ہما نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ”وسیم نے کس کو قتل کیا ہے؟“

”وسیم نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“ وہ زخمی لہجے میں بولی۔ ”اس پر جھوٹا الزام لگایا جا رہا ہے۔“

”ہاں، ہاں........ میرا یہی مطلب تھا۔“ میں نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا، پھر پوچھا۔ ”وسیم پر کس کو قتل کرنے کا الزام ہے؟“

”مقتول کا نام عارف ہے........ یا پھر عاصم ہے۔“ وہ اُلجھن زدہ انداز میں بولی۔

”کمال ہے!“ میں نے رف پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

”ایک شخص کے بہ یک وقت دو نام کیسے ہو سکتے ہیں؟“

”بات دراصل یہ ہے، وکیل صاحب! کہ اس کم بخت نے وسیم کو اپنا نام عاصم بتایا تھا اور حسان کو عارف۔ یہ عارف یا عاصم خاصا شیخی خور بندہ تھا۔“

”اور یہ حسان صاحب کون ہیں؟“ میری پوری توجہ، ہما پر مرکوز تھی۔

”کوئی اخباری رپورٹر ہے یہ شخص۔“ وہ بے زاری سے بولی۔

”ہما صاحبہ!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے اب تک جو تفصیل بتائی ہے، اسے سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے شوہر مقتول کو اچھی طرح جانتے تھے۔“

”ان لوگوں کا روز کا ملنا جلنا تھا۔“ ہما نے بتایا۔

”لوگوں کا........؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا ان کے ساتھ کئی اور افراد بھی تھے؟“

”یہ چار افراد کی ایک چھوٹی سی ٹولی تھی۔“ وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولی۔ ”یہ چاروں صبح صدر کے علاقے میں ملاقات کرتے تھے، کسی چائے خانے میں بیٹھ کر چائے پیتے، تھوڑی گپ شپ لگاتے، پھر اپنے اپنے کام کے لئے نکل جاتے۔“

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوئی، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”وسیم، حسان، عارف کے علاوہ چوتھا شخص ٹیلی فون کے محکمے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا نام ظفر علی ہے۔“

”ہما صاحبہ! آپ کی باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے، ان چاروں میں اچھی خاصی دوستی تھی........“ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”پھر عارف کے قتل کا الزام وسیم پر کیوں آ رہا ہے؟“

”وہ بات دراصل یہ ہے کہ اس واقعے سے چند روز پہلے کسی بات پر وسیم اور عارف میں خاصی تلخ کلامی........ ہاتھا پائی ہو گئی تھی اور دونوں نے ایک دوسرے کو بڑی بڑی دھمکیاں بھی دے ڈالی تھیں، لہٰذا اس بدمزگی کے چند روز بعد جب عارف قتل ہو گیا تو پولیس نے وسیم کو اس کے قتل کے الزام میں دھر لیا۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے، ہمارے ملک کی پولیس کا مزاج کس قسم کا ہے!“

”ہاں، اس مزاج سے ہر کوئی واقف ہے۔“ میں نے خیال انگیز انداز میں کہا۔

”لیکن ایک بات پوری طرح میری سمجھ میں بیٹھ نہیں سکی۔“

مجھے اُلجھن میں مبتلا دیکھ کر وہ جلدی سے بولی۔ ”کون سی بات، وکیل صاحب؟“

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ چاروں افراد آپس میں کوئی مشترکہ بزنس بھی کرتے تھے؟''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' اس نے بتایا۔

''وسیم اور عارف میں کسی نوعیت کی شراکت داری؟''

''بالکل نہیں۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلا دی۔

''دیکھیں خاتون!'' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ کے شوہر کی مقتول کے ساتھ اچھی خاصی دوستی تھی۔ ٹھیک ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''ہم فی الحال حسان اور ظفر کو بھول جاتے ہیں اور ملزم و مقتول یعنی آپ کے شوہر وسیم اور عارف کا ذکر کرتے ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں جواب دیا۔ میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''وسیم اور عارف میں گہرا یارانہ تھا، وہ روزانہ ملتے تھے اور چائے پر گپ شپ کرتے تھے۔ جب تعلقات کی نوعیت اتنی گہری ہو تو پھر اس قسم کے جھگڑے کی صرف دو ہی وجوہ ہوتی ہیں۔ اب یہ آپ مجھے بتائیں گی کہ ان کے درمیان اختلافات کا سبب کیا تھا؟''

''مثلاً کون سی وجوہات وکیل صاحب؟'' ہما نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔

''نمبر ایک، دونوں دوستوں کے بیچ اچانک بہت ساری دولت آ گئی ہو؟'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''وکیل صاحب! یہ وجہ تو بالکل نہیں ہو سکتی، کیونکہ ان دونوں کا تعلق معاشرے کے متوسط طبقے سے ہے۔ ان کے درمیان بہت زیادہ دولت کی آمد کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔''

ہما نے بتایا۔ ''اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وسیم ضرور مجھے بتاتا۔''

''تو پھر یقیناً ان کے بیچ کوئی عورت آ گئی ہو گی؟'' میں نے ٹٹولنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں سمجھ گیا کہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے۔ ان کے معاملے میں بھی کسی عورت کی ذات ملوث ہے۔ ہما کو متذبذب دیکھ کر میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟''

''کسی حد تک آپ اپنے اندازے کو درست کہہ سکتے ہیں۔'' وہ متاملانہ انداز میں بولی۔

''کس حد تک؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات دراصل وہ نہیں ہے، جو آپ سمجھ رہے ہیں۔'' وہ خاصی متذبذب تھی۔

''ہما صاحبہ! میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔'' آپ مجھے اپنے شوہر کا وکیل مقرر کرنا چاہتی ہیں۔ آپ کے خیال کے میں وسیم بے گناہ ہے۔ آپ کی کوشش بلکہ خواہش ہے کہ میں وسیم کو قتل کے اس جھوٹے مقدمے سے باعزت بری کراؤں۔ اگر واقعی آپ اس مقصد کے لئے سنجیدہ ہیں تو پھر آپ کو مجھ پر بھرپور اعتماد کرنا ہو گا۔ اگر آپ مجھ سے کچھ چھپائیں گی تو پھر میری جانب سے کسی مثبت نتیجے کی توقع نہیں رکھنا۔''

''وکیل صاحب! میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔'' وہ اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں تو چاہتی ہوں، آپ جلد از جلد وسیم کو اس مصیبت سے نجات دلا دیں۔''

''تو پھر آپ مجھے کھل کر بتائیں کہ وسیم اور عارف کے بیچ وہ عورت والا کیا معاملہ تھا جسے آپ ''کسی حد تک'' کہہ رہی ہیں اور آپ کا یہ خیال بھی ہے کہ میں بات کی حقیقت کو سمجھ نہیں پا رہا ہوں؟'' بات ختم کر کے میں سوالیہ نظروں سے ہما کو دیکھنے لگا۔

اس نے چند لمحے خاموش رہ کر ذہن میں بکھرے ہوئے خیالات کو مجتمع کیا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''وکیل صاحب! میں آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ واضح کر دوں کہ وہ چاروں صدر کے علاقے میں روزانہ کیوں جمع ہوتے تھے، تاکہ آپ ان کے ملاپ کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔''

''ضرور......ضرور۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ایسے نیک کام میں تاخیر

بالکل مناسب نہیں ہوگی۔"

ہما مجھے بتانے لگی۔

"ان چاروں میں مشترک ایک کنڈر گارٹن سکول ہے۔ ان کی ملاقات روزانہ صبح اسی اسکول میں ہوتی تھی۔ یہ ایک نرسری لیول کا اسکول ہے، جہاں کے جی ون اور کے جی ٹو کے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ عارف کا بچہ یعنی بیٹا، کے جی ون میں پڑھتا ہے۔ حسان اور ظفر کی بیٹیاں، کے جی ٹو میں ہیں اور ہماری بیٹی نرسری مکمل کرنے کے بعد اب ایک دوسرے اسکول میں کلاس ون میں پڑھ رہی ہے اور......"

"ایک منٹ، ہما صاحبہ!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "جب آپ کی بیٹی اس کنڈر گارٹن اسکول سے نکل کر کسی دوسرے اسکول میں جا چکی ہے تو پھر وسیم باقاعدگی کے ساتھ وہاں کیوں جاتا تھا؟"

"میں آپ کو وہی بتانے والی تھی کہ آپ نے سوال کر دیا۔" وہ بڑی رسانیت سے بولی۔

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے...... آپ اپنے بیان کو جاری رکھیں۔"

"وسیم پک اینڈ ڈراپ کا کام کرتا ہے۔" ہما نے بتایا۔ "عموماً وہ اسکول کے بچوں ہی کو اُٹھاتا ہے۔ ہماری اپنی گاڑی ہے۔ یہ کار دن بھر پک اینڈ ڈراپ کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ شام چھ بجے کے بعد ہمارے گھریلو استعمال میں آجاتی ہے۔" وہ لمحے بھر کو رکی، ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"عارف اپنے بیٹے کو صبح خود اسکول چھوڑتا تھا اور واپسی میں بچہ وسیم کی گاڑی میں جاتا تھا۔ ظفر علی اپنی بیٹی کو بائیک پر لاتے، لے جاتے ہیں۔ حسان نے اپنی بیٹی کے لئے ایک رکشہ ارینج کر رکھا ہے۔ اب میں ایک چھوٹے سے مذاق کا ذکر کروں گی، جس کی وجہ سے وسیم اور عارف میں جھگڑا ہوا تھا۔"

وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوئی، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"عارف کے توسط سے وسیم کو ایک بچہ ملا، جو لیاقت آباد کا رہنے والا تھا۔ عارف کی رہائش بھی لیاقت آباد المعروف بہ لالوکھیت میں ہے۔ اس بچے کا گھر عارف کے گھر سے دو گلیوں کے فاصلے پر ہے، جب کہ ہم لوگ ناظم آباد کے علاقے میں رہتے

ہیں۔ ہماری اپارٹمنٹس بلڈنگ کے نیچے ایک معروف ریسٹورنٹ بھی ہے۔ (ہما نے مجھے اس ریسٹورنٹ کا نام بھی بتایا تھا، لیکن بہ وجوہ ریسٹورنٹ کا نام یہاں ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے مذکورہ ہوٹل میں ایک دو مرتبہ کھانا کھانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں کی ڈشوں کی اپنی ایک لذت ہے) وہ بچہ، جس کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے، اس کا باپ پاسپورٹ آفس میں ملازم ہے۔ کے جی ون کے بچے جب پہلی مرتبہ اسکول آتے ہیں تو خاصا پھڈا کرتے ہیں۔ وہ والدین کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے، خاص طور پر وہ بچے جو اکیلی اولاد ہوں اور والدین کے لاڈلے بھی۔ یہی حال فیصل اور شرمین کے بیٹے کا بھی تھا۔"

وہ لمحے بھر کو رکی تو میں نے پوچھ لیا۔

"فیصل اور شرمین سے آپ کی مراد وہ لوگ ہیں، جن کا بچہ مقتول عارف کے توسط سے وسیم کو ملا تھا؟"

"جی ہاں، میں انہی کی بات کر رہی ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "بچے کی ضد کو دیکھتے ہوئے والدین نے فیصلہ کیا کہ ابتدا میں چند روز وہ صبح خود اسے اسکول پہنچائیں گے، لیکن واپسی میں وسیم ہی بچے کو گھر پہنچائے گا۔ لہٰذا فیصل اور شرمین بائیک پر روزانہ صبح بچے کو اسکول لانے لگے اور چھٹی کے وقت وسیم اسے لے جاتا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ وسیم کو ایک مذاق سوجھا۔ یہ مذاق دراصل ایک خوف ناک شرارت تھی، جس کے پیچھے حسان کا شیطانی ذہن کام کر رہا تھا۔

"دراصل شرمین بہت خوب صورت عورت ہے اور یہی عورت اس فساد کی جڑ ثابت ہوئی ہے۔ تفصیل تو آپ وسیم سے ہی پوچھیں، مجھے بھی بہت بعد میں پتہ چلا تھا۔ بہرحال، یہ سارا شیطانی چکر اس رپورٹ حسان نے چلایا تھا۔ اس نے وسیم کو اُلٹی سیدھی پٹی پڑھائی کہ عارف یا عاصم کے ساتھ تفریح لینا چاہئے۔ ایک طے شدہ شرارت کے تحت وسیم نے دوستوں کی محفل میں یہ کہنا شروع کر دیا کہ شرمین اس پر بہت مہربان ہے۔ جب وہ دن میں اس کے بیٹے کو ڈراپ کرتا ہے تو اکثر وہ چائے وغیرہ کے بہانے اسے گھر کے اندر بلا لیتی ہے۔ عارف بنیادی طور پر ایک شیخی خور اور جیلس آدمی تھا۔ وسیم اور شرمین کے تعلقات کے قصے سن کر وہ سلگ کر رہ جاتا۔ لیکن ظاہر ہے، وہ کھل کھلا کر احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم یہ احساس اسے جلاتا رہتا کہ شرمین اس کے

توسط سے وسیم سے متعارف ہوئی تھی اور اب وہ لوگ عارف کو بھول کر وسیم سے تعلق جوڑ بیٹھے ہیں۔ شرمین بے چاری کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس کے نام کے استعمال سے کیا کہانی بُنی جا رہی ہے۔ عارف کو ستانے اور تپانے کا خیال بھی ایک خاص سبب سے آیا تھا۔ ان چاروں کی جب نئی نئی ملاقات ہوئی تو عارف نے انہیں متاثر کرنے کے لئے اپنی ذات کے حوالے سے بہت قصے سنائے تھے، جن میں وہ کسی گل فام سے کم نہ ہوتا، وہ جس لڑکی کی جانب نظر بھر کر دیکھتا، وہ اس پر فریفتہ ہو جاتی۔ یہ قصے کہانی سن کر حسان کو بہت غصہ آتا اور اسی نے عارف کو سزا دینے کے لئے شرمین اور وسیم کی محبت والا فرضی ڈرامہ اسٹیج کیا، جسے عارف سچ سمجھ کر کڑھتا رہتا۔ ایک دن حد ہو گئی، جب وسیم نے خود پر شرمین کے التفات اور نوازشات کا ایک رنگین و سنگین قصہ سنا ڈالا۔ اگلے روز عارف موقع دیکھ کر اس وقت فیصل کے گھر پہنچ گیا، جب شرمین کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ رسمی کلمات کے بعد وہ اصل موضوع پر آ گیا اور شرمین سے شکوہ کرنے لگا کہ اس کی مہربانیوں کا سب سے زیادہ حق دار تو وہ ہے اور شرمین، وسیم کے ساتھ وقت برباد کر رہی ہے۔ وکیل صاحب! آپ اندازہ لگا لیں، عارف کے اس عمل پر شرمین نے کیا ردِعمل ظاہر کیا ہو گا۔“

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور خفت آمیز سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں، مجھے اچھی طرح اندازہ ہے۔ شرمین، عارف کے منہ سے ایسی لغویات سن کر آگ بگولا ہو گئی ہو گی اور جوتے مار کر اسے اپنے گھر سے باہر نکال دیا ہو گا۔“

”بالکل........ اسی قسم کا سین ہوا تھا۔“ ہما نے تائیدی انداز میں کہا اور بتایا۔

”اگلے روز صبح ہوٹل میں وسیم اور عارف کے بیچ جھگڑا ہو گیا۔ تلخ کلامی سے بات آگے بڑھی تو وہ دونوں دست و گریباں ہو گئے۔ ظفر اور حسان موقع پر موجود تھے۔ انہوں نے بیچ بچاؤ کر کے کسی بڑے فساد کو پھوٹنے سے روک دیا۔ بہرحال، اس گرما گرمی کے بعد ان کے درمیان تعلق نہ رہا۔ حتیٰ کہ شرمین اور فیصل بھی عارف سے نفرت کرنے لگے۔ عارف نے اپنی صفائی پیش کرنے اور وسیم کو موردِ الزام ٹھہرانے کی بہت کوشش کی، لیکن کسی کو وسیم کی اس شرارت کا یقین نہ آیا۔ شیطانی ذہن کے مالک حسان نے اتنی صفائی

سے چکر چلایا تھا کہ سانپ کا کام بھی ہو گیا اور لاٹھی بھی محفوظ رہی........ اس کے علاوہ شرمین کے ایک عمل نے قیامت برپا کر دی۔“

ہما ڈرامائی انداز میں متوقف ہوئی، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے بولی۔

”شرمین چونکہ عارف کی محلے دار بھی تھی اس لئے دو گلیوں کے فاصلے پر وہ عارف کے گھر پہنچ گئی اور اس کے عظیم الشان کارنامے کے بارے میں عارف کی بیوی کو سب کچھ بتا دیا۔ عارف کی بیوی یہ قصہ سن کر ہکا بکا رہ گئی۔ وسیم ان کے بیٹے کو بھی دوپہر میں گھر چھوڑنے جاتا تھا اور ہمیشہ آپ جناب اور باجی سے مخاطب ہوتا تھا۔ عارف کی بیوی وسیم کی شرافت اور خوش اخلاقی سے بھی متاثر تھی۔ اسے قطعاً یقین نہیں آیا کہ وسیم اس قسم کی بے ہودہ شرارت بھی کر سکتا ہے۔ اس نے بھی عارف ہی کو برا بھلا کہا۔ وسیم کا معصوم چہرہ اور حسان کی پلاننگ نے سچویشن کا پلڑا وسیم کے حق میں جھکائے رکھا، چنانچہ عارف کو اس نازیبا حرکت پر اپنی بیوی کے سامنے بھی اچھی خاصی ہزیمت اٹھانا پڑی۔ اس واقعے کے بعد وسیم سے جو کوئی بھی پوچھتا کہ کیا اس نے یہ شرارت کی تھی تو وہ جواب میں صاف مکر جاتا۔ ظفر علی کو انہوں نے اس طرح اعتماد میں لے لیا تھا کہ عارف بالکل اکیلا رہ گیا۔ اس ایک کے مقابلے میں، لوگ ان تینوں کی بات کو زیادہ اہمیت دیتے۔ اس طرح عارف کو ایک عبرت ناک صورتِ حال سے گزرنا پڑتا۔“

وہ ایک مرتبہ پھر تھمی، ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی، پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”بیگ صاحب! میں مانتی ہوں، وسیم نے جو حرکت عارف کے ساتھ کی، وہ قابلِ مذمت ہے۔ اگر مجھے اس شرارت کا پہلے پتہ چل جاتا تو میں وسیم کو ہرگز ہرگز ایسا نہ کرنے دیتی۔ اس منظم شرارت کے پیچھے حسان کا شیطانی دماغ اور ظفر علی کا تفریحی تعاون کارفرما رہا ہے۔ لیکن یہ وسیم کا اتنا بڑا جرم نہیں کہ اسے عارف کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جائے۔“

وہ خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا۔

”عارف قتل ہوا، یہ اپنی جگہ ایک حقیقت ہے لیکن میں یہ جاننا چاہوں گا کہ اس

واقعے کے بعد پولیس نے کس بنا پر وسیم کی جانب رخ کیا؟"

ہما نے بتایا۔

"اس معاملے کی تفتیش کے سلسلے میں، پولیس مقتول کے گھر پہنچی تھی اور انہوں نے سب سے زیادہ سوالات عارف کی بیوی......میرا مطلب ہے، اس کی بیوہ سے کئے، جن میں سب سے اہم سوالات یہ تھے......مقتول کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تو نہیں تھی؟ اس واقعے سے قبل مقتول کا کسی شخص سے جھگڑا، پھڈا وغیرہ ہوا ہو؟"

ہما نے ذرا سا توقف کر کے اُمید بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔

"بیگ صاحب! یہ دونوں ایسے سوالات تھے کہ عارف کی بیوی نے فوراً وسیم کا نام پیش کر دیا، اور اس کے ساتھ ہی، صدر کے ہوٹل میں ہونے والے جھگڑے کی تفصیل سے بھی پولیس کو آگاہ کر دیا۔ پولیس کے لئے اتنا اشارہ ہی کافی تھا۔ انہوں نے ہمارے گھر پر ریڈ کیا اور وسیم کو عارف کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ بعد میں پولیس نے صدر والے اس ہوٹل پر جا کر بھی پوچھ گچھ کی ہے، جہاں وسیم اور عارف کا جھگڑا ہوا تھا۔ اس طرح وسیم پر پولیس کا شک اور مضبوط ہو گیا۔ یہ ہے ساری کہانی۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی۔"

"ہوں......!" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا، پھر ایک لمحے کے توقف سے پوچھا۔ "عارف کے قتل والا واقعہ کب پیش آیا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "پیر...... چوبیس نومبر۔"

"اوہ......!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "یعنی پرسوں...... آج نومبر کی چھبیس ہے۔ اس کا مطلب ہے، کل پولیس نے وسیم کو عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا!"

"جی ہاں......ایسا ہو چکا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "وسیم کو پولیس نے کب اور کہاں سے گرفتار کیا تھا؟"

"رات سات بجے، گھر سے۔"

میں نے اس سے دریافت کیا کہ وسیم کس تھانے میں بند ہے؟ اس نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے، ہما صاحبہ! میں کل کسی وقت تھانے جا کر وسیم سے ملاقات کر لوں گا اور اس کی کہانی سننے کے بعد ضروری ہدایات بھی دے دوں گا۔ ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد ہی عدالتی چارہ جوئی ہو سکے گی۔"

میں لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

"آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بے فکر ہو کر گھر جائیں اور......اپنے گھر کا فون نمبر مجھے نوٹ کرا دیں۔ میں وسیم سے ملاقات کرنے کے بعد آپ سے رابطہ کروں گا۔"

اس نے اپنے گھر کا فون نمبر لکھوایا اور پوچھا۔

"وکیل صاحب! آپ نے اپنی فیس کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں۔"

میں نے اس کے سوال کے جواب میں اسے اپنی فیس سے آگاہ کیا۔

اس نے فیس ادا کی۔ میں نے فوراً ادائیگی بہ الفاظِ دیگر وصولی کی رسید بنا دی اور مذکورہ رسید کے ساتھ ہی اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی اس کی جانب بڑھا دیا اور کہا۔

"کوئی بھی خاص بات پتہ چلے یا کسی وقت بھی میری ضرورت پیش آئے تو آپ مجھے فون کر سکتی ہیں۔ اس پر آفس کے علاوہ میرے گھر کا نمبر بھی درج ہے۔"

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اسے خدا حافظ کہا تو وہ جانے کے لئے مڑی اور دروازے کی جانب قدم اُٹھانے لگی۔ پھر پتہ نہیں، کیا یاد آیا کہ وہ دروازے کے پاس سے پلٹی اور متذبذب نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا، ہما صاحبہ؟ کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"پتہ نہیں، مجھے آپ سے یہ سوال کرنا چاہئے یا نہیں۔" وہ اُلجھن زدہ لہجے میں بولی۔ "بات ذرا غیر متعلق سی ہے۔"

"آپ کہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں پوری طرح متوجہ ہوں۔"

اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "شاہانہ خیریت سے آئی تھی؟"

"شاہانہ......" میں نے تعجب خیز لہجے میں کہا۔ "کون شاہانہ؟"

"مجھ سے پہلے ایک عورت آپ کے کمرے میں سے نکل کر گئی تھی۔" وہ وضاحت

کرتے ہوئے بولی۔ ”میں اس کی بات کر رہی ہوں۔“

ہما سے ایک منٹ پہلے فرحانہ ناز میرے کمرے سے اُٹھ کر گئی تھی۔ ہما کے توجہ دلانے پر مجھے وہ طرح دار حسینہ یاد آ گئی، جسے میری شادی کی بڑی فکر لگی ہوئی تھی۔ میں اس پُرتاثر، خوب رو معمہ عورت کو ذرا بھی سمجھ نہیں پایا تھا اور اب ہما اسی کے بارے میں مجھ سے استفسار کر رہی تھی، لیکن مختلف نام کے ساتھ۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”کیا آپ اس عورت کو جانتی ہیں؟“

”ہاں، تمہاری علیک سلیک ہے، شاہانہ سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ابھی لابی میں ہمارا سامنا ہوا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر شناسا سے انداز میں مسکرائی تھیں لیکن ”ہیلو ہائے“ سے زیادہ بات نہیں ہوئی۔ شاید وہ جلدی میں تھی۔“

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے تھمی، پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”اسی لئے تو میں نے آپ سے پوچھا ہے کہ وہ یہاں خیریت سے آئی تھی نا؟“

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں تصدیق چاہی۔

”آپ نے اس کا نام شاہانہ بتایا ہے، لیکن.......“

”اس نے آپ کو کوئی اور نام بتایا ہے۔“ وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھی۔ ”ہے نا یہی بات؟“

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور فرحانہ کا دیا ہوا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے میرے ہاتھ سے کارڈ لے کر اس پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”فرحانہ ناز....... یہ اس کا کوئی نیا ڈرامہ ہے!“

”ڈرامہ؟“ میں نے اسی کے الفاظ کو دہرایا اور کہا۔ ”وہ میری بھی سمجھ میں نہیں آئی، نہ ہی میں یہ پتہ چلا سکا کہ وہ کس مقصد سے میرے پاس آئی تھی۔ وہ آئی، دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور اپنا وزیٹنگ کارڈ تھما کر چلی گئی۔“

”اِدھر اُدھر کی دو چار باتوں سے بھی آپ کو اندازہ نہیں ہوا کہ وہ آپ کے پاس کیوں آئی تھی؟“ ہما نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے ہما کسی خاص حوالے سے مجھ پر شک کر رہی ہو۔ یہ اس امر کا بھی ثبوت تھا کہ فرحانہ یا شاہانہ کی ریپوٹیشن اچھی اور شفاف نہیں تھی، لہٰذا میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ہما کو، فرحانہ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا اور آخر میں کہا۔

”ان بے معنی باتوں سے آپ کی سمجھ میں کچھ آ رہا ہے؟“

”بیگ صاحب! ان باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آپ کی ذات میں گہری دلچسپی لے رہی ہے۔“ وہ ذومعنی لہجے میں بولی۔ ”ہو سکتا ہے، اگلی ملاقات میں وہ.......آپ کو پرپوز کر دے۔“

”الٰہی خیر.......!“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ پھر میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ”اس نے مجھے اپنا نام فرحانہ بتایا، آپ اسے شاہانہ کہہ رہی ہیں۔ میں تو اس سے آج پہلی مرتبہ ملا ہوں، لہٰذا اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مگر آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اس سے بہ خوبی واقف ہیں، اس لئے آپ ہی مجھے کچھ بتائیں۔“

وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے خاموش رہ کر وہ مختلف خیالات کو اپنے ذہن میں ترتیب دیتی رہی، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”بیگ صاحب! میں نے شاہانہ کے پرپوزل والی بات مذاق میں نہیں کہی....... وہ ایسا کر سکتی ہے۔ اس کا سابق ریکارڈ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے۔“

”مثلاً.......؟“ میں نے اس کے بیان میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”بتائیں، اس نے ماضی قریب میں ایسا کون سا کارنامہ انجام دیا ہے؟“

”میں وہی بتانے جا رہی ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، وہ ایسی ہی ٹرائی کامران مرزا پر بھی مار چکی ہے۔“

”کامران مرزا....... یہ کون صاحب ہیں؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

اس نے بتایا۔

”میں نے تھوڑی دیر پہلے آپ سے ایک ہوٹل کا ذکر کیا تھا، جو ہماری اپارٹمنٹس بلڈنگ کے نیچے واقع ہے۔ کامران اس ریسٹورنٹ کے مالک کا نام ہے۔ اللہ خیر

کرے........آپ کے اور کامران کے نام میں لفظ ''مرزا'' قدرے مشترک ہے۔''

''اوہ........!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں اس کی کوئی ٹرائی کامیاب ہونے والی نہیں، بہرحال........ یہ بتائیں، کامران مرزا والے معاملے کا کیا نتیجہ برآمد ہوا تھا؟''

''کامران مرزا کی بیوی بڑی اسٹرانگ تھی۔'' ہما نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس نے شاہانہ کی کوئی چال کامیاب نہیں ہونے دی اور اپنے شوہر کو اس کے چکر سے نکال کر ہی دم لیا۔''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''وکیل صاحب! آپ ایک تجربہ کار اور کامیاب وکیل ہیں۔ آپ کی بیوی بھی ایک سمجھ دار خاتون ہو گی۔ مجھے امید ہے، وہ شاہانہ کی دال نہیں گلنے دے گی۔''

ہما کو میں نے اپنی اور فرحانہ کی گفتگو کے بارے میں جو کچھ بھی بتایا تھا، اس میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں آیا تھا کہ میری شادی ہو چکی ہے یا نہیں۔ اسی لئے اس نے میری بیوی کے حوالے سے یہ ذکر کیا تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بڑے واضح الفاظ میں کہا۔

''میں اسے دال چڑھانے ہی نہیں دوں گا، لہٰذا گلنے یا نہ گلنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے.....آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نے ابھی شادی نہیں کی۔''

اس کے چہرے پر ایک دم تشویش اُبھر آئی، گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''پھر تو آپ اس کے لئے آسان ٹارگٹ ثابت ہوں گے۔''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔ ''مجھ پر محنت کرتے ہوئے اسے دانتوں پسینہ آ جائے گا۔ اینی ہاؤ........آپ کو فرحانہ........ یا شاہانہ کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم ہے، وہ مجھے بتائیں تاکہ اسے ہینڈل کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئے........اور یہ بھی بتائیں کہ وہ اپنی شادی کے لئے خود ہی اتنی سرگرم کیوں ہے؟ کیا اس کا کوئی بڑا بزرگ نہیں ہے؟''

ہما نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''شاہانہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور یہ لوگ خاصے پوش علاقے میں رہتے ہیں۔ اس کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے، لیکن باپ ابھی زندہ ہے۔ اس کا باپ محکمہ پولیس میں ایک بڑے عہدے سے ریٹائر ہوا ہے۔ والدین نے کوئی بیس سال پہلے اس کی شادی بھی کروائی تھی، لیکن بدقسمتی سے یہ شادی کامیاب نہیں ہو سکی۔ اور........اب میں کیا کہوں!''

وہ اتنا کہہ کر یک دم خاموش ہوئی تو میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

''کیا واقعی بیس سال پہلے اس کی شادی ہو گئی تھی؟''

''بیگ صاحب! میں آپ سے غلط کیوں کہوں گی؟'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''کمال ہے........یقین نہیں آ رہا، آپ کو؟''

''یہی کہ بیس سال قبل اس کی شادی ہوئی ہو گی۔'' میں نے متذبذب انداز میں کہا۔ ''اس کی عمر تو اتنی زیادہ نظر نہیں آتی۔''

''یہی اس کا پلس پوائنٹ ہے۔'' ہما نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایک تو وہ عمر کی چور ہے........دوسرے وہ خود کو مینٹین رکھنے کے سلسلے میں خاصی محنت کرتی ہے۔ آپ کو یہ سن کر بڑی حیرت ہو گی کہ اس کی اٹھارہ سال کی ایک بیٹی بھی ہے۔ ردا نام ہے اس کا اور وہ کالج میں پڑھتی ہے۔''

''واقعی، مجھے بالکل یقین نہیں آ رہا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے اندازے کے مطابق تو وہ تیس سال سے زیادہ کی نظر نہیں آتی۔''

''بعض لوگوں کے جسم کی بناوٹ اور چہرے کے تاثرات ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی اصل عمر کے بارے میں لگائے گئے اندازے غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔ انسانی آنکھ ان کے حوالے سے دھوکا کھا جاتی ہے۔''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میری معلومات کے مطابق، شاہانہ اس وقت پینتالیس کا ہندسہ عبور کر چکی ہے!''

''اوہ........'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر ہما سے پوچھا۔ ''آپ اس کی شادی کی ناکامی پر تھوڑی روشنی ڈالیں گی؟''

ہما میرے پاس اپنی مصیبت لے کر آئی تھی، اس کے شوہر کو پولیس نے قتل کے الزام میں بند کر رکھا تھا اور وہ میرے ذریعے اپنے شوہر کی باعزت بریّت چاہتی تھی۔ لیکن فرحانہ........ یا پھر شاہانہ کے موضوع نے اس کا موڈ یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ وہ جب میرے چیمبر میں داخل ہوئی تو سخت پریشان اور اُلجھی ہوئی تھی، لیکن اب بڑے نارمل انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔

''بیگ صاحب! جہاں تک میں شاہانہ کی ہسٹری سے واقف ہوں، اس کا شوہر سعید زماں اسے چھوڑ کر فرانس چلا گیا تھا۔ وہ سال، ڈیڑھ سال جو ایک ساتھ بھی رہے تو یہ عرصہ لڑنے جھگڑنے ہی میں بیتا پھر کوئی بہت خطرناک پھڈا ہوا اور سعید زماں اسے چھوڑ کر فرانس چلا گیا۔ اس ''چھوڑنے'' کی حقیقت اور اصلیت کیا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ سعید زماں چونکہ پلٹ کر واپس نہیں آیا، اس لئے اس کے مؤقف سے کوئی آگاہ نہیں۔ شاہانہ کا دعویٰ ہے کہ سعید اسے طلاق دے کر گیا تھا۔ جب یہ واقعہ پیش آیا، ردا شاہانہ کی گود میں تھی۔ اس کی عمر چند ماہ رہی ہوگی۔ بہرحال........''

وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوئی، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''ان سترہ اٹھارہ سالوں میں شاہانہ نے چار پانچ مرتبہ شادی کرنے کی کوشش کی، لیکن ہر بار اس کی بدقسمتی سے کچھ نہ کچھ ایسا ہو گیا کہ عین آخری مرحلے میں معاملہ بگڑ گیا۔ ایک مثال کامران مرزا کی تو میں آپ کو دے ہی چکی ہوں۔ بیگ صاحب! میں تو ایک بات جانتی ہوں۔ انسان اگر خلوصِ نیت سے شادی کا ارادہ رکھتا ہو تو اس کی شادی کہیں نہ کہیں ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن شاہانہ کے ساتھ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے جس کے سبب کوئی نہ کوئی اپ سیٹ ہو جاتا ہے اور اس کا بنا بنایا سیٹ اپ فلاپ ہو کر رہ جاتا ہے۔''

اس کے خاموش ہونے پر میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہما صاحبہ! جہاں اتنا کچھ بتایا ہے، یہ بھی فرما دیں کہ اس عورت کے ساتھ کون سا نفسیاتی عارضہ ہے؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اس پر یہ سنک سوار ہے کہ کسی معروف اور کامیاب شخص سے شادی کرے گی،

تاکہ وہ سعید زماں پر یہ ثابت کر سکے کہ وہ کتنی اہم ہے۔ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تو یہ اس کی بے وقوفی تھی، وہ قدر ناشناس تھا، جبکہ اس کے قدر دانوں کی کمی نہیں۔ لیکن اکثر کامیاب لوگوں کے ساتھ ایک مسئلہ ہے!''

وہ اُلجھن زدہ انداز میں متوقف ہوئی تو میں نے پوچھ لیا۔ ''کیسا مسئلہ؟''

وہ بولی۔

''یہ مسئلہ کہ انسان کو کامیاب شخصیت بننے کے لئے بہت محنت کرنا پڑتی ہے اور اس رات دن کی محنت میں جہاں اسے تجربہ حاصل ہوتا ہے، وہاں اس کی عمر بھی بہت تیزی سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب وہ شہرت اور کامیابی کے اُفق پر اپنی چمک دکھانے کے قابل ہوتا ہے تو وہ چالیس کے ہندسے کو کراس کر چکا ہوتا ہے، یا اس کے اریب قریب ہی کہیں کھڑا ہوتا ہے۔ اور ایسے سو افراد میں سے عموماً نوے کی شادی بھی ہو چکی ہوتی ہے۔ شاید اسی لئے........'' وہ سانس ہموار کرنے کے لئے متوقف ہوئی، پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''شاید اسی لئے شاہانہ نے آپ کی زندگی میں اکاؤنٹ کھولنے سے پہلے ہی یہ پوچھ لیا ہے کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں۔ اس میدان میں وہ خاصے تلخ تجربات سے گزر چکی ہے۔ ریسٹورنٹ والے کامران مرزا کی مثال آپ کے سامنے ہے۔''

''اس شاہانہ عرف فرحانہ کو میں سمجھ لوں گا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بہرحال، یہ مفید معلومات بہم پہنچانے کے لئے میں آپ کا بے حد شکرگزار ہوں۔''

دو چار ضروری باتوں کے بعد میں نے ہما کو رخصت کر دیا۔

●......●......●

آئندہ روز عدالت میں میری زیادہ مصروفیات نہیں تھیں۔ میں لگ بھگ بارہ بجے فارغ ہو گیا۔ لنچ میں ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے باقی تھے، لہٰذا میں نے متعلقہ تھانے جا کر ہما کے شوہر وسیم سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ دن کے وقت، رات کی بہ نسبت تھانے جا کر کسی حوالاتی سے ملاقات کرنا قدرے سہل ثابت ہوتا ہے!

میں نے کم و بیش آدھا گھنٹہ وسیم کے ساتھ گزارا۔ اس آدھے گھنٹے میں اس نے

مجھے کیس کے حوالے سے بڑی اہم اور مفید معلومات فراہم کیں۔ وسیم کی عمر لگ بھگ پینتالیس سال رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور مضبوط کاٹھی کا مالک تھا۔ ہاتھ پاؤں سے محنت اور چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ کم الفاظ میں اگر اس کی تعریف کرنا مقصود ہو تو وہ ایک معقول اور شریف النفس انسان تھا۔

میں نے اس سے وکالت نامے اور دیگر ضروری کاغذات پر دستخط لئے اور تسلی تشفی کے بعد وہاں سے چلا آیا۔ میری حوصلہ افزا تکنیکی باتوں نے اس کے اندر اُمید کی کرن جگا دی تھی۔ ایک بات کا میں نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ مجرم نہیں تھا، لہٰذا اُس کی بریّت کے لئے سرتوڑ کوشش کرنا میری ذمے داری تھی۔

ہما پہلے ہی اس کیس کے حوالے سے مجھے کافی باتیں بتا چکی تھی۔ وسیم نے اس سلسلے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ تفریحی، بلکہ شیطانی انداز میں شروع ہونے والا یہ کھیل اس کے لئے وبالِ جان بن گیا تھا۔

عدالتی کارروائی سے قبل میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کیس کی کچھ تفصیل آپ کی نذر کر دی جائے، تاکہ آپ عدالت کے کمرے میں، وجود میں آنے والی سچویشن کو انجوائے کر سکیں۔

ہما اور وسیم کی شادی کو کم و بیش بارہ سال ہوئے تھے۔ ان کی دو اولادیں تھیں۔ بڑی بچی علیزہ کلاس ون میں پڑھتی تھی، جبکہ چھوٹی بیٹی ابھی چند ماہ کی تھی۔ علیزہ ان کی شادی کے کافی عرصے بعد پیدا ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی اپنی دونوں بچیوں کے ہمراہ بڑی پُرسکون زندگی گزار رہے تھے کہ وسیم پر اچانک یہ افتاد آن پڑی۔

ہما ایک پڑھی لکھی اور قابل عورت تھی۔ گاڑی کے دوسرے پہیے کے طور پر وہ بھی معاشی زندگی کی گاڑی کو کھینچنے کے لئے شوہر کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ ہما ایک معروف غیرملکی فارماسیوٹیکل کمپنی کے ویئر ہاؤس میں انچارج کی حیثیت سے کام کر رہی تھی، جہاں سے اُسے ایک ہینڈسم سیلری ملتی تھی۔ بارہ سو اسکوائر فٹ رقبے پر مشتمل فلیٹ ذاتی تھا، لہٰذا زندگی میں کوئی دُکھ یا پریشانی نہیں تھی۔ ہما فارماسیوٹیکل ہی کے پروڈکشن ڈیپارٹمنٹ کا بھی وسیع تجربہ رکھتی تھی۔

دو سال پہلے تک وسیم بھی ایک فارماسیوٹیکل ہی میں کوالٹی کنٹرول کے شعبے میں

کام کر رہا تھا۔ لیکن پھر کمپنی کے حالات میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اصل مالک پسِ پردہ چلا گیا۔ اُس کے بیٹوں نے بزنس سنبھالا تو انہوں نے سب سے پہلے پرانے ورکرز کی چھٹی کر دی۔ ان کا یہ عمل حماقت اور ناتجربہ کاری کا مظہر تھا۔ جو ورکرز ان کے لئے سب سے زیادہ مفید ہو سکتے تھے، انہوں نے انہی کا پتا صاف کر دیا۔ فارغ کئے جانے والے افراد کی جگہ خوشامدی اور دوست احباب لینے لگے۔ چنانچہ بزنس کو بیک گیئر لگ گیا۔ فارماسیوٹیکل کمپنی کی پروڈکشن درجنوں آئٹمز سے گھٹ کر صرف ایک تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اب یہ کمپنی صرف ایک ایسا سیرپ بنا رہی تھی، جو معدے کی تیزابیت دُور کرنے کے کام آتا تھا۔

بہرحال، فیکٹری سے فارغ ہونے کے بعد وسیم نے خاصا مشکل وقت دیکھا۔ گھر میں دو گاڑیاں تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد ایک بِک گئی۔ فوری طور پر کوئی نئی اور مناسب جاب نہیں مل رہی تھی۔ یہ تو غنیمت تھا کہ ہما ایک اچھی جاب پر تھی، اس لئے زیادہ مالی تنگی نہیں دیکھنا پڑی۔ اس دوران ایک عید آئی تو وسیم نے کچھ عرصے کے لئے اپنے بھائی کی دکان پر بھی بیٹھنا شروع کر دیا۔ اس کے بھائی کی طارق روڈ پر گارمنٹس کی شاپ تھی، جہاں بچوں کے ملبوسات فروخت ہوتے تھے۔ عید کی گہما گہمی میں دکان کا کام بڑھ گیا تھا، لہٰذا وسیم دوپہر کے بعد طارق روڈ کی طرف نکل جاتا۔ لیکن عید کے بعد جیسے ہی کام ٹھنڈا پڑا، اس نے اُدھر کا رُخ کرنا چھوڑ دیا۔ اس دوران میں یاروں دوستوں کے مشورے بھی جاری تھے۔ سکول آنے کی وجہ سے حسان، عارف اور ظفر علی سے اچھی علیک سلیک ہو گئی تھی۔

ایک روز حسان نے وسیم سے کہا۔

”وسیم بھائی! یہ نوکری ووکری کی تلاش کا چکر چھوڑ دو۔ میری مانو تو تم یہ پک اینڈ ڈراپ ہی کو اپنا فل ٹائم بزنس بنا لو۔ سیر کی سیر اور کسی سیٹھ یا باس کی غلامی بھی نہیں۔ نوکری وغیرہ میں کچھ نہیں رکھا۔“

وسیم نے حیرت اور اُلجھن کی ملی جلی کیفیت میں حسان کی طرف دیکھا اور کہا۔

”لیکن حسان بھائی! اس کی آمدنی میں گزارہ ممکن نہیں۔ یہ تو میں اسی لئے کر رہا ہوں کہ جب اور کچھ نہیں تو یہی سہی۔“

"آمدنی کم اور گزارہ ممکن اس لئے نہیں ہے کہ تم اس کام کو پارٹ ٹائم یا ٹائم پاس کی حیثیت سے کر رہے ہو۔" حسان نے بڑے بزرگوں کے سے انداز میں کہا۔ "اگر تم ذہن بنالو کہ اسی کو فل ٹائم کرنا ہے تو پھر تمہارے پاس بچے بھی بڑھ جائیں گے۔ صبح کی شفٹ کے ساتھ ساتھ دوپہر کی شفٹ بھی اُٹھانے لگو تو ہینڈسم سیلری والی کسی بھی جاب سے زیادہ کمانے لگو گے اور آزادی کی آزادی بھی......... کسی سیٹھ کی بک بک اور نہ ہی کسی باس کی جھک جھک۔ بس، کسی طرح تم پندرہ سے زیادہ بچے گھیر لو، پھر کام چل نکلے گا۔"

"حسان بھائی! کیا کہہ رہے ہو؟ پندرہ بچے!" وسیم نے بے یقینی سے حسان کی طرف دیکھا۔ "میرے پاس چھوٹی سی گاڑی ہے۔ اس میں زیادہ سے زیادہ چھ بچے بٹھا سکتا ہوں اور آپ پندرہ کی بات کر رہے ہو۔"

حسان نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"یار! اللہ پر بھروسہ رکھ کر کوشش تو کرو۔ بچے بڑھیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تمہارے رزق کو کشادہ کر رہا ہے۔ لہٰذا وہ تمہارے لئے ذرائع بھی بنائے گا۔ تم اس پرانی سی چھوٹی گاڑی کو فروخت کر کے کوئی وین خرید لینا، جس میں زیادہ گنجائش ہوتی ہے اور گاڑی کی گاڑی بھی۔ اسکول کے بعد اپنی فیملی کے لئے بھی استعمال کرنا اور "پکنک اینڈ پارٹی" پر بھی چلانا۔"

"حسان یار! تم کہہ تو ٹھیک رہے ہو۔" وسیم نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"میں تو ہمیشہ ہی ٹھیک کہتا ہوں۔" حسان نے عام سے لہجے میں کہا۔ "لیکن لوگوں کی سمجھ میں میری بات ذرا دیر سے آتی ہے۔ خیر......... آپ کے سلسلے میں ایک اور کام بھی ہوسکتا ہے۔"

حسان نے بات پوری کر کے پُرسوچ انداز میں وسیم کی جانب دیکھا تو اس نے جلدی سے پوچھا۔ "کون سا کام، حسان بھائی؟"

"میری چھوٹی سالی ایک بینک کے ہیڈ آفس میں کام کرتی ہے۔" حسان نے کہا۔

"میں آپ کے بارے میں اس سے بات کرتا ہوں۔ بینک میں جاب کرنے والی لڑکیوں کو اچھی سیلری ملتی ہے اور ان میں سے اکثر وین وغیرہ ہی سے بینک آتی ہیں۔

اگر دو لڑکیاں بھی مل جائیں تو وہ پندرہ بچوں پر بھاری ہیں۔ تم آرام سے پہلے بچوں کو اسکول پہنچانا، پھر ان لڑکیوں کو گھر سے اُٹھا کر بینک وغیرہ ڈراپ کر دینا۔ اس کام کے لئے تمہیں اچھا خاصا وقت بھی مل جائے گا۔ ان کی جاب نائن ٹو فائیو ہوتی ہے۔ تمام بچوں کو گھر پہنچانے کے بعد آرام سے لنچ کرنا اور پھر بینک وغیرہ کی طرف نکل جانا......... شام چھ کے بعد فرصت ہی فرصت......... آزادی ہی آزادی۔ کہو، آئیڈیا کیسا ہے؟"

"ونڈرفل.........!" وسیم نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "حسان یار! کوشش کرو۔ اگر یہ سیٹنگ بن جاتی ہے تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں۔"

حسان نے کوشش کرنے کا وعدہ کرلیا۔

وعدے کے مطابق، اس نے کوشش بھی کی لیکن فوری طور پر کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ اس دوران عارف کا بیٹا......... اور عارف کے توسط سے فیصل کا بیٹا، وسیم کو مل گیا۔ دیکھا دیکھی دو تین بچے مزید مل گئے۔ اب صرف ایک اسکول ہی کے چھ بچے ہو گئے تھے۔ وسیم کے گھر کے قریب ہی کسی ٹیچر کا کوچنگ سنٹر تھا، جہاں شام میں پڑھایا جاتا تھا۔ کوشش کرنے پر اپنے ہی علاقے کے پانچ چھ بچے اسے کوچنگ سنٹر کے توسط سے مل گئے۔ الغرض، اس کا ایک اچھا سیٹ اپ بن گیا۔

حالات مخصوص ڈگر پر آگے بڑھ رہے تھے کہ وہ واقعہ پیش آگیا، جس کے طفیل وسیم اس وقت عدالتی ریمانڈ پر متعلقہ تھانے کی حوالات میں بند تھا۔ کہانی کی ابتدا میں، ہما کی زبانی اس شریر واقعے کے بارے میں کافی حد تک بیان کر دیا گیا ہے۔ وسیم سے مجھے جو نئی باتیں پتہ چلیں، ذرا ان کا بھی ذکر ہو جائے تو یہ قصہ تشنہ نہیں رہے گا۔"

اس کنڈرگارٹن اسکول کی اسمبلی تک یہ چاروں گیٹ کے باہر کھڑے ہلکی پھلکی گپ شپ کرتے رہتے تھے اور جب بچے کلاسز میں چلے جاتے تو وہ لوگ چائے خانے میں آ بیٹھتے، باقی کی گپیں وہیں لگائی جاتی تھیں۔

ایک روز وسیم اور حسان حسبِ معمول اسمبلی کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ حسان نے کہا۔

"وسیم بھائی! ظفر صاحب نے تو آج نہ آنے کے بارے میں کل چھٹی کے وقت بتا دیا تھا، لیکن یہ اپنے عارف بھائی کہاں غائب ہیں؟"

''کون عارف بھائی؟'' وسیم نے چونک کر پوچھا۔

''یار! وہ جن کے بچے کو آپ واپسی میں گھر پہنچاتے ہیں۔'' حسان نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''جو صبح میں گورنمنٹ ڈیوٹی کرتے ہیں اور شام میں مارکیٹنگ وغیرہ۔''

''حسان بھائی! اُن کا نام عارف نہیں، بلکہ عاصم ہے۔'' وسیم نے تصحیح کرنے والے انداز میں کہا۔ ''میں خود حیران ہوں کہ وہ ابھی تک پہنچے کیوں نہیں۔ ٹائم کے معاملے میں وہ بڑے پابند ہیں۔''

''کیا واقعی ان کا نام عاصم ہے؟'' حسان نے اُلجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''مجھے تو انہوں نے عارف بتایا تھا۔ ان کا تعلق فیصل آباد سے ہے اور ان کی سسرال اسلام آباد میں ہے۔ وہ پہلے اسلام آباد میں رہتے تھے۔ ان کی وائف وہاں کسی پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھی۔ حال ہی میں یہ لوگ یہاں کراچی شفٹ ہوئے ہیں۔''

حسان لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی، پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''دو چار روز پہلے وہ بچے کی فیس کے لئے پے آرڈر بنوانا چاہتے تھے۔ بے چارے بڑے پریشان تھے۔ مجھ سے ان کی پریشانی دیکھی نہ گئی اور میں نے اپنی بچی کی فیس کے ساتھ ہی ان کا پے آرڈر بھی بنوا دیا تھا۔''

''استاد!'' وسیم نے بے تکلفانہ انداز میں حسان کی طرف دیکھا۔ ''یہ بندہ کوئی چکر چلا رہا ہے۔'' اس کا اشارہ عارف (عاصم) کی جانب تھا۔ ''اس نے مجھے تو فیصل آباد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ہاں، البتہ یہ ضرور کہا ہے کہ اس کی بیوی اسلام آباد کی رہنے والی ہے۔ اور یہ کہ وہ لوگ یہیں کراچی کی پیدائش ہیں۔ ایک طویل عرصے سے لیاقت آباد میں رہ رہے ہیں۔ لیکن...... یہ عارف اور عاصم کا جھمیلا سمجھ سے باہر ہے۔''

وہ بات کرتے کرتے سوچنے والے انداز میں متوقف ہوا، پھر مشورہ کرنے والے انداز میں حسان سے پوچھا۔

''اس کو ایک ہی وقت میں پکڑ کر پوچھ تاچھ کرتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟''

''خیال تو اچھا ہے۔'' حسان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ''لیکن خرابی یہ ہے کہ وہ اس طرح بدک جائے گا۔''

''پھر کیا کریں؟...... اس کی حقیقت تو سامنے آنا چاہئے نا؟'' وسیم نے کہا۔

اس وقت تک ان لوگوں نے باقاعدہ چائے خانے میں بیٹھ کر گپ شپ کا آغاز نہیں کیا تھا۔ حسان نے کہا۔

''اس کے ساتھ بیٹھ کر چائے وغیرہ پیتے ہیں۔ وہیں آہستہ آہستہ گھس کر اصلیت کو سامنے لائیں گے۔''

اس آئیڈیا پر اتفاق رائے ہو گیا۔ چنانچہ اگلے روز سے انہوں نے اجتماعی چائے نوشی کی شروعات کر دی۔ وسیم اور حسان ابھی تک عارف یا عاصم کی تفتیش مکمل نہیں کر پائے تھے کہ اس بندۂ خدا نے اپنے کارناموں کے قصے سنانا شروع کر دیئے، جن میں وہ کسی گلفام سے کم نہیں تھے۔ یہ ساری تفصیل کہانی کے ابتدائی حصے میں بیان کی جا چکی ہے۔

عارف کی ان فضول کہانیوں کو سن کر حسان کو ایک خطرناک شرارت سوجھی۔ اس نے وسیم کو اعتماد میں لے کر ایک سنسنی خیز ڈراما اسٹیج کرنے کا پروگرام بنایا۔ وسیم نے تفریح کی خاطر یہ سب کرنا قبول کر لیا۔ دراصل، حسان اس طرح عارف کو اس کی دروغ گوئی کے لئے سنگین اور ناقابلِ فراموش سزا دینا چاہتا تھا۔

ظفر علی کو اس ڈرامے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ ظفر ایک سادہ دل، معصوم سا انسان تھا۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتا تھا، گفتگو میں بھی برابر کا شریک تھا۔ لیکن اسے اس معاملے کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وسیم اور حسان باہمی پلاننگ سے کون سا کھیل، کھیل رہے ہیں۔

پروگرام کے مطابق، ایک روز وسیم نے عارف سے کہا۔

''یار! کل تو میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہے۔ ابھی تک میرا دماغ سنسنا رہا ہے۔''

''کیوں بھائی!...... ایسا کیا ہو گیا؟'' عارف نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس وقت ان دونوں کے آس پاس اور کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ حسان طے شدہ

پروگرام کے مطابق، انہیں چھوڑ کر کسی ضروری کام سے نکل گیا تھا اور ظفر علی بھی غائب تھا۔ وسیم نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔

''یار! کل صبح میں فیصل کے گھر گیا تھا.......'' وہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو گیا۔

عارف نے جلدی سے پوچھا۔ ''کل تو اسکول کی چھٹی کا دن تھا، پھر آپ وہاں کیا لینے گئے تھے؟''

''وہی تو بتا رہا ہوں۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''وہ، بات دراصل یہ ہے کہ پرسوں اسکول سے واپسی میں فیصل کا بیٹا اپنی لیسن ڈائری میری گاڑی میں بھول گیا تھا۔ میں نے بھی اس وقت دھیان نہیں دیا۔ کل صبح گاڑی کی صفائی کرنے لگا تو وہ ڈائری مجھے نظر آ گئی۔ آپ تو جانتے ہی ہو، لیسن ڈائری میں ہوم ورک لکھا ہوتا ہے۔ میں نے سوچا، اگر وہ ڈائری گاڑی ہی میں پڑی رہی تو فیصل کا بیٹا ہوم ورک نہیں کر سکے گا۔ میں وہی ڈائری پہنچانے صبح صبح ان کے گھر چلا گیا.......''

وسیم نے ایک مرتبہ پھر جملہ نامکمل چھوڑا تو عارف نے بیزاری سے پوچھا۔ ''تو اس میں کون سی خاص بات ہے؟''

''خاص بات سنو گے تو پھڑک جاؤ گے، عاصم بھائی!'' عارف نے چونکہ وسیم کو اپنا نام عاصم بتایا ہوا تھا، لہٰذا وہ اسے اسی نام سے پکارتا تھا۔

عارف نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو فوراً بتاؤ۔''

عارف کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے وسیم نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''میں نے جب وہاں پہنچ کر فیصل کے گھر کی گھنٹی بجائی تو تھوڑی دیر کے بعد شرمین دروازے پر نمودار ہوئی۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی حالت حواس اور جذبات پر بجلیاں گرانے والی تھی۔ میں ہونق سا کھڑا رہا.......''

اتنا بتا کر وسیم خاموش ہو گیا۔

''کیوں بھائی.......!'' عارف نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ''آپ نے شرمین میں ایسا کیا دیکھ لیا تھا؟''

''صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ نیند سے اُٹھ کر آئی تھی۔'' وسیم نے تنویمی لہجے میں بتایا۔

''بال بے ترتیب، آنکھوں میں خمار اور جسم پر مہین کپڑے کی نائٹی۔''

عارف کا دل اتھل پتھل ہونے لگا، بے اختیار اس کی زبان سے نکلا۔

''پھر.......؟''

''پھر یہ کہ.......وہ میری طرف دیکھ کر بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی اور ایک خمار آلود جماہی لیتے ہوئے مستفسر ہوئی.......: وسیم صاحب! اتنی صبح....... خیریت تو ہے؟''

میں نے اسے اپنی آمد کی وجہ بتائی۔ اس نے مسکرا کر میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے بچے کی لیسن ڈائری اس کی جانب بڑھائی اور جانے کے لئے مڑ ہی رہا تھا کہ اس کی رسیلی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''میں آپ کو ایسے تو نہیں جانے دوں گی، وسیم صاحب!''

''جی.......؟'' میں نے پلٹ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے اعتماد سے بولی۔

''آپ چائے پیئے بغیر میرے گھر سے نہیں جا سکتے۔ پلیز اندر آ جائیں۔''

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ مڑی اور دروازے کے پیچھے غائب ہو گئی۔ اس کے ''پلیز'' میں اتنی قوت تھی کہ بے اختیار میرے قدم اس کے گھر میں داخل ہو گئے۔ اس نے مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور یہ کہتے ہوئے اندرونی حصے میں، نظر سے اوجھل ہو گئی۔

''ابھی آتی ہوں، وسیم صاحب!''

''اور پھر شرمین کے بجائے فیصل آپ کو کمپنی دینے ڈرائنگ روم میں چلا آیا ہو گا؟'' عارف نے کسی تجربہ کار گرو کے اسٹائل میں کہا۔

''نہیں.......'' وسیم نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلا دی۔

''کیا مطلب.......؟'' عارف نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیا اس کا شوہر گھر میں موجود نہیں تھا؟''

''نہیں۔'' وسیم نے نفی میں گردن ہلا دی۔ ''میں یہی سوچ کر اس کے گھر میں داخل ہوا تھا کہ چلو، فیصل سے گپ شپ کر لوں گا اور جب وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا رہی تھی تو میں نے اس سے فیصل کے بارے میں پوچھا بھی۔ تبھی اس نے بتایا کہ آج

چھٹی ہے، لہٰذا فیصل بیٹے کے ساتھ حیدرآباد گیا ہے۔ حیدرآباد میں شرمین کی نند رہتی ہے۔ فیصل اپنی بہن سے ملنے گیا تھا اور اس کی واپسی رات ہی کو ہونا تھی۔"

عارف ایک محروم النساء قسم کا شخص تھا۔ وسیم کی سوچی سمجھی اسٹوری نے اس کے اندر جذبات کا ایٹم بم گرا دیا۔ اس نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

"کیا شرمین اس وقت گھر میں بالکل اکیلی تھی؟"

"ہاں یار!........ میں یہی تو بتا رہا ہوں۔" وسیم نے نگاہ چراتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف انسان!" عارف کسی جگادری کی طرح بولا۔ "ایسی صورتِ حال میں تو تمہیں ایک لمحہ بھی وہاں نہیں رُکنا چاہئے تھا۔"

عارف کے تنبیہی انداز پر وسیم نے ندامت آمیز نظر سے اِدھر اُدھر دیکھا، پھر بولا۔

"یار! اُس نے اتنی مہلت ہی نہیں دی۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا، وہ مجھے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر چلی گئی۔ اب یہ تو انتہائی اخلاق سے گری ہوئی بات ہوتی کہ میں وہاں سے چپ چاپ اُٹھ کر چلا آتا۔ اگر روز کا ملنا نہ ہوتا تو شاید میں ایسا کر بھی لیتا۔ مگر آپ جانتے ہو، میں روزانہ ان کے بچے کو........"

"ہاں، ٹھیک ہے۔" عارف نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی اور کہا۔ "آگے بتائیں، پھر کیا ہوا؟"

"پھر تھوڑی دیر کے بعد ہی شرمین میرے لئے چائے بنا کر لے آئی۔" وسیم نے عارف کے ناآسودہ ارمانوں پر آرے چلاتے ہوئے کہا۔ "میں تو یہی سمجھ رہا تھا، وہ چائے رکھ کر اندر چلی جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور وہ وہیں، میرے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی اور وہ بھی اکڑوں انداز میں۔"

"اوہ........!" عارف نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور اضطراری لہجے میں پوچھ لیا۔ "شرمین نے لباس تو ڈھنگ کا پہن لیا ہوگا؟"

"کہاں یار........؟" وسیم نے حسان کے اسکرپٹ کے مطابق کہا۔ "وہ بہ دستور اسی مہین نائٹی میں ملبوس تھی۔ بس سمجھ لو، صاف چھپتے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں........ والی صورتِ حال تھی۔ اور پھر وہ جس کھلے ڈُلے پوز میں براجمان تھی، وہ اور بھی حیر انگیز اور قیامت خیز تھا۔ یقین کرو، میں تو ڈر ہی گیا تھا........"

بات ادھوری چھوڑ کر وسیم نے ایک خوف زدہ جھرجھری لی۔

"ہوں........" عارف نے ٹٹولنے والی نظروں سے وسیم کے چہرے کا جائزہ لیا اور کہا۔ "پھر آپ نے شرمین کے ہاتھوں کی تیار کردہ چائے پی اور واپس آ گئے۔"

"ارادہ تو میرا یہی تھا۔ لیکن اس نے زبردستی روک لیا۔" وسیم نے مبہم سے انداز میں کہا۔

عارف کی آنکھیں پھیل گئیں، کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئیں اور سرسراتی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا۔

"زبردستی........ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ........ اس نے کہا، وسیم صاحب! بس، آپ ابھی نہیں جائیں گے۔" وسیم نے عارف کے ذہن و دل کو تہ و بالا کرتے ہوئے کہا۔ "اُس کے اس جملے میں ایسا میٹھا تحکم تھا، ایسی چٹ پٹی پیش کش تھی اور اتنی گہری اپنائیت تھی کہ میں خود کو پتھر کا بت محسوس کرنے لگا۔ ان لمحات میں شرمین جنت سے آئی ہوئی کوئی حور دکھائی دے رہی تھی۔ حریری لبادے نے اس کے حُسن کی چمک اور گلاب بدن کی مہک کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ ڈرائنگ روم کا ماحول روشن روشن اور عطر بیز ہو گیا تھا۔ کیف و انبساط کی فضا نے میرے اعصاب کو مخمور اور حواس کو مجبور کر دیا تھا۔ میری زبان میں انکار کی قوت نہیں رہی تھی۔ جب شرمین نے دل نشین انداز میں یہ کہا تو میں بے بس ہو گیا........!

وسیم نے عارف کے صبر و برداشت کو سُولی پر چڑھانے کے لئے بات ادھوری چھوڑی تو عارف نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"یہ کہا........ مطلب، کیا کہا........؟"

"شرمین نے کہا تھا، وسیم صاحب! مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔"

"کیا ضروری کام؟" عارف کے کان کھڑے ہو گئے۔

"جب میں اس کی مقناطیسی فرمائش پر وہاں رک گیا تو اس نے ضروری کام کے بارے میں بھی بتایا۔" وسیم نے تجسس اور سنسنی خیزی کو ایک لمحے کے لئے بھی ماند نہیں پڑنے دیا تھا۔ یہ حسان کے اسکرین پلے اور وسیم کی اداکاری کا مشترکہ کمال تھا۔

"وہ مجھ سے فیصل کے بارے میں بات کرنا چاہتی تھی۔"

"کیا بات؟...... فیصل کو کیا ہو گیا؟" عارف نے جلدی سے پوچھا۔

وسیم نے فائل پنچ لگاتے ہوئے بتایا۔

"عاصم بھائی! یہ شرمین بڑی دُکھی عورت ہے۔ آپ نے دیکھا ہے، اس کی خوب صورتی میں کوئی کلام نہیں۔ صاف نظر بھی ڈالو تو میلی ہو جانے کا خدشہ محسوس ہوتا ہے۔ لیکن قدرت نے اس کے نصیب کو اچھا نہیں بنایا۔ بے چاری کے ساتھ اس گھر میں بڑا ظلم ہو رہا ہے...... یہ جو فیصل ہے نا......"

"ہاں، ہاں...... فیصل ہے۔" عارف بے تابی سے بولا۔

وسیم نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اس کم بخت کے پاس نہ شکل ہے اور نہ ہی عقل، بالکل بونگا لگتا ہے۔ جب کہ شرمین تو چاند کی کلی اور مصری کی ڈلی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس گدھے کے نکاح میں آ گئی ہے۔ یہ تو پہلوئے حور میں لنگور، خدا کی قدرت والی مثال ہو گئی۔"

وسیم نے سانس درست کرنے کے لئے لمحاتی توقف کیا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ فیصل اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا۔ اسے بے دریغ مارتا بھی ہے۔ ایسا ناقدرا ہے کہ اس سے ذرا محبت نہیں کرتا۔ جب کہ شرمین کا جوبن تو پوجنے کے لائق ہے۔ اس جنگلی کو شرمین کی ذرا بھی پروا نہیں۔ بڑے دکھ سے بتا رہی تھی کہ وہ محبت...... سچی محبت کے ایک جھونکے کو ترسی ہوئی ہے۔ خالص پیار کی تلاش میں وہ چاروں طرف نظر دوڑاتی رہتی ہے۔ کاش! اُسے خلوصِ دل سے چاہنے والا کوئی مل جائے۔"

وسیم نے اتنا بتانے کے بعد جائزہ نظر سے عارف کی طرف دیکھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ خود پر ضبط کئے وہاں بیٹھا ہو۔ ورنہ اس کا جی تو چاہ رہا تھا، وہ ابھی اور اسی وقت اُڑ کر شرمین کے پاس پہنچ جائے۔ پھر اس تشنہ آرزو، ناآسودہ عورت کا ہاتھ تھام کر کہے...... میں ہوں نا!

وسیم نے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے آخری سین چلا دیا۔

"میں وہاں بیٹھا شرمین کی بپتا سنتا رہا۔ جس حد تک ممکن تھا، میں نے اس کی اشک شوئی کی اور مفید مشورے بھی دیئے۔ پھر مجھے وہاں سے اُٹھنا پڑا کیونکہ......"

وسیم کے "کیونکہ" نے عارف کے دل پر چھریاں سی چلا دیں، اس نے تڑپ کر پوچھا۔ "کیونکہ...... کیا وسیم بھائی؟"

"کیونکہ اپنی محرومی کی داستان سناتے ہوئے شرمین اتنی جذباتی اور بے قابو ہو گئی تھی کہ اگر میں ایک لمحہ بھی وہاں ٹھہر جاتا تو مجھے بھی خود پر اختیار نہ رہتا۔" وسیم نے آخری کیل ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "پھر اس وقت میں آپ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے بڑی شرمندگی ہوتی۔ میری نگاہ زمین میں گڑ جاتی۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے بچا لیا۔"

"ٹھیک کیا آپ نے وسیم بھائی!...... بالکل ٹھیک کیا۔" عارف نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "انسان ایک مرتبہ اس گناہ کی دلدل میں قدم ڈال دے تو پھر رفتہ رفتہ اسے موت کے منہ میں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ مجھے آپ کے عمل پر فخر ہے۔"

وسیم نے بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہاں نظر آنے والے تاثرات، عارف کی سوچ کی عکاسی کر رہے تھے، جو ظاہر ہے اس کے بیان سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ ان لمحات میں عارف، وسیم کے حوالے سے کچھ اس انداز میں سوچ رہا تھا۔

"وسیم بھائی! تم نرے گدھے ہو...... جو بہتی ہوئی گنگا سے سوکھے ہاتھ واپس آ گئے۔ یہ صرف میں ہی نہیں کہہ رہا، بلکہ آپ کے بارے میں شرمین کے بھی ایسے ہی خیالات ہوں گے۔ لیکن میں اس ضرورت مند عورت کو مایوس نہیں کروں گا۔ آپ اپنی شرافت...... بہ الفاظ دیگر، اپنی حماقت کے طفیل جو غلطی کر گئے ہو، اس کی تلافی بھی مجھے ہی کرنا ہے۔"

اگلے روز عارف موقع دیکھ کر اس وقت فیصل کے گھر پہنچ گیا، جب شرمین کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اس کے بعد جو اینٹی دھماکا ہوا، اس کی تفصیل ابتدائی صفحات میں بیان کی جا چکی ہے۔

●......●......●

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے چالان عدالت میں پیش کر دیا۔

اس دوران میں نے کیس کی ابتدائی تیاری مکمل کر لی تھی۔ اس تیاری کے مختلف مراحل پر جو دلچسپ اور اہم باتوں سے آگاہی حاصل ہوئی، اس کا بیان عدالتی کارروائی کے دوران کیا جائے گا۔

عدالت کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ پولیس کی طرف سے استغاثہ دائر کیا گیا تھا اور اس موقع پر مجھے اپنے موکل، عارف کے قتل کے الزام میں گرفتار یعنی اس کیس کے ملزم مسٹر وسیم کی ضمانت کے لئے زور مارنا تھا۔ میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ضمانت کے کاغذات بھی پیش کر دیئے تھے۔ جج کی آمد پر کارروائی شروع ہوئی۔

میں نے اپنے مؤکل کی ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے معزز عدالت سے استدعا کی۔

”ملزم وسیم کی گرفتاری اور اس کیس میں ملوثی کی کوشش ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ ہے۔ ایک خطرناک پلاننگ کے تحت میرے مؤکل کو اس معاملے میں پھنسایا جا رہا ہے۔ ملزم اس معاشرے کا ایک امن پسند، صلح جو اور شریف النفس فرد ہے۔ محلے میں اور محلے کے باہر آج تک اس کے خلاف کوئی شکایت سننے میں نہیں آئی۔ اس کا پولیس ریکارڈ صاف و شفاف ہے۔ فارما سیوٹیکل کمپنی اس کی شرافت اور ایمانداری کی سند جاری کرنے کو تیار ہے۔ یہ شخص جن جوان بچیوں کو اسکول لاتا اور لے جاتا ہے، وہ اور ان کے والدین ملزم کے بہترین اخلاق اور حُسنِ سلوک کی گواہی دے سکتے ہیں۔“

میں لمحے بھر کے لئے سانس درست کرنے کو متوقف ہوا، پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”جنابِ عالی! یہ سچ ہے کہ میرا مؤکل ذرا جذباتی قسم کا انسان ہے۔ اس روز جب چائے خانے میں مقتول اور ملزم کے مابین جھگڑا ہوا تو مقتول کی طیش بھری باتوں کے جواب میں ملزم نے بھی غصیلے انداز میں اسے خطرناک نتائج کی دھمکی دے دی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ واقعی اس کی جان لینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میرے مؤکل کا یہ جارحانہ ردِعمل ایک خاص وجہ سے تھا......“

میں بات ادھوری چھوڑ کر ایک بار پھر متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور

سنجیدہ لہجے میں اپنے بیان کو آگے بڑھایا۔

”یور آنر! میں نے ابھی اپنے مؤکل کے جس جارحانہ ردِعمل کا حوالہ دیا ہے، وہ انسانی فطرت اور نفسیات کے عین مطابق ہے۔ اگر کسی شخص پر خوامخواہ جھوٹا الزام لگایا جائے تو اس کھرے انسان کو غصہ آ جانا لازمی بات ہے۔ اور اگر وہ انسان کھرا، سچا ہونے کے ساتھ ساتھ جذباتی بھی ہو تو پھر اس کی جانب سے ایسے ہی جوابی رویّے کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ میرے مؤکل کے ساتھ بھی کچھ اسی نوعیت کی صورتِ حال پیش آئی تھی۔“

میں نے ایک بار پھر لمحاتی توقف کیا اور بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”جنابِ عالی! مقتول کو پیش آنے والے جان لیوا واقعے سے چند روز قبل، مقتول اور ملزم کے درمیان ایک سنگین قسم کا پھڈا ہوا تھا۔ ملزم خود سے منسوب ایک بے بنیاد بات پر چراغ پا ہو گیا اور اس نے غصے کے عالم میں مقتول کو برا بھلا بھی کہہ ڈالا تھا۔ اسی سبب استغاثہ کی تمام تر توپوں کا رخ اس کی طرف ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے جناب! کہ میرے مؤکل کا قتل کے اس واقعے سے دُور کا بھی کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ لہٰذا میں معزز عدالت سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ ملزم وسیم کی ضمانت کی درخواست کو منظور فرمایا جائے۔ اس کیس کی وجہ سے میرے مؤکل کی نیک نامی اور کاروبار پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ دیٹس آل یور آنر!“

پہلے ہما اور ازاں بعد وسیم کی زبانی یہ بات میرے ریکارڈ پر آ چکی تھی کہ وسیم اور حسان کی ملی بھگت کے نتیجے ہی میں مقتول عارف کو شرمین سے جوتے کھانے پڑے تھے۔ لیکن چونکہ وسیم نے کسی بھی مرحلے پر اس ”حرکت“ کا اقرار نہیں کیا تھا، لہٰذا میں نے بھی اسے عدالت کے ریکارڈ پر لانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے اپنے مؤکل کو فائرنگ اسکواڈ کے سامنے سے باحفاظت گزار کر لے جانا تھا۔ لہٰذا کسی بھی تحفظاتی پلس پوائنٹ کو خوامخواہ ضائع کرنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوتا!

میرے خاموش ہونے پر وکیل استغاثہ نے ضمانت کے خلاف بڑھ چڑھ کر دلائل دیئے اور معزز عدالت کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ ابتدائی مرحلے پر ملزم کی ضمانت منظور کرنا انصاف کے اصولوں کے منافی ہوگا۔ اس سے کیس پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔

اس بات کا خدشہ ہے کہ آزاد ملزم کیس کے مختلف زاویوں کو بگاڑنے کی کوشش کرے گا۔ ازیں علاوہ میرے پاس بعض ایسے ٹھوس ثبوت موجود ہیں، جو اس بظاہر معصوم نظر آنے والے شخص کی اصلیت کو بے نقاب کر دیں گے۔ لہٰذا میری استدعا ہے کہ اس کیس کی باقاعدہ سماعت کا جلد از جلد آغاز کیا جائے اور ملزم کو جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے۔

آئندہ پندرہ بیس منٹ تک استغاثہ اور ڈیفنس میں گرما گرم بحث ہوتی رہی، جس کے نتیجے میں جج نے میرے مؤکل کی درخواست ضمانت کو نامنظور کرتے ہوئے اسے جیل کسٹڈی کا حکم سنا دیا۔

پہلے بھی کئی مرتبہ اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ قتل کے الزام کی ضمانت، کیس کے ابتدائی مراحل میں ناممکن کی حد تک مشکل ہوتی ہے۔ حقیقت یہی ہے۔ ورنہ فلموں اور ٹی وی ڈراموں میں یہ کام خاصا آسان نظر آتا ہے۔

اسی روز شام میں ہما میرے آفس آئی۔ وہ خاصی ڈسٹرب دکھائی دیتی تھی۔ اس کی یہ کیفیت عین فطری اور سچویشن کے مطابق تھی۔ اس کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی، اس کا یہی حال ہوتا۔ میں نے عدالتی معاملات کے نشیب و فراز سمجھا کر اسے خاصی حد تک مطمئن کر دیا۔ اس کا ذہن بٹانے کے لئے میں نے شاہانہ عرف فرحانہ ناز کا قصہ چھیڑ دیا۔ اس دلچسپ ”کردار“ کے حوالے سے ہمارے درمیان کافی باتیں ہوئیں۔ جب وہ میرے دفتر سے رخصت ہوئی تو بڑی حد تک ریلیکس ہو چکی تھی۔

ہما کے جانے کے بعد میں تھوڑی دیر تک شاہانہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ جب سے گئی تھی، اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ وہ جاتے ہوئے اس انداز میں مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دے گئی تھی کہ میں اسے فون کروں اور میں نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات میں اس عجیب وغریب عزائم کی مالک پُرکشش عورت کو بھول ہی گیا تھا۔ میری اس ”بھول“ کو آپ اپنے ذوق کے مطابق کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔



آئندہ پیشی پر عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر

سنائی۔ ملزم وسیم نے میری ہدایت کے مطابق صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

استغاثہ کی جانب سے کُل پانچ گواہوں کے نام دیئے گئے تھے، لیکن میں ان صفحات میں نہایت ہی اہم گواہوں اور ان پر ہونے والی جرح ہی کا احوال بیان کروں گا۔ سب سے پہلے رنگین ہوٹل کا مالک مقام خان گواہی دینے کے لئے وٹنس باکس میں آیا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بعد وکیلِ استغاثہ جرح کے لئے کٹہرے کے پاس چلا گیا۔

وکیلِ استغاثہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا، پھر ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔

”خان صاحب! کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟“

مقام خان نے اپنے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔

”جی، اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ لوگ ہمارے ہوٹل پر روزانہ چائے پینے آتے تھے۔ پھر ان میں جھگڑا ہو گیا اور اس بندے نے آنا چھوڑ دیا، جو قتل ہو گیا ہے۔ اس کا چھوٹا داڑھی بھی تھا۔“

مقام خان کا اشارہ مقتول عارف کی جانب تھا۔ وکیل استغاثہ نے اگلا سوال کیا۔

”ان لوگوں میں جھگڑا کیوں ہوا تھا؟ اور جھگڑے کی نوعیت کیا تھی؟“

”نوعیت........ خدا آپ کا بھلا کرے........“ گواہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”نوعیت بڑی سنگین تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کا گریبان بھی پکڑا اور دھمکیاں بھی دیں۔ ہمارا خیال ہے، کسی عورت کے معاملے پر ان میں جھگڑا ہوا تھا، ہمیں شک تھا، ایک دن ایسا ہوگا۔“

وکیل استغاثہ نے اپنے مطلب کی بات کو اُجاگر کرتے ہوئے تصدیقی لہجے میں کہا۔

”آپ کا مطلب ہے، ملزم نے اس جھگڑے میں مقتول کو کوئی خطرناک دھمکی دی تھی؟“

”جی وکیل صاحب! یہی بات ہے۔“ استغاثہ کا گواہ اثبات میں گردن ہلاتے

ہوئے بولا۔ ”مقتول بڑی تیز آواز میں۔ لڑائی کر رہا تھا۔ ہم کو حیرت ہوا کہ یہ لوگ بڑے اچھے دوست تھے، پھر ان کو کیا ہو گیا۔ جھگڑا ہمارے ہوٹل میں ہوا تھا، اس لئے ہم نے آگے بڑھ کر ان کا لڑائی ختم کرایا۔ مقتول بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس کو چھوڑے گا نہیں۔“ گواہ نے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، پھر اپنی بات کو آگے بڑھا دیا۔

”مقتول کا کہنا تھا کہ اس نے بڑی گھٹیا حرکت کی ہے۔ اس حرکت کے جواب میں وہ خاموش ہو کر نہیں بیٹھے گا، اس بات کا بدلہ ضرور لے گا۔ ملزم نے بھی خطرناک انداز میں مقتول سے کہا تھا کہ اگر اس نے کوئی شکایت کی تو بہت پچھتائے گا۔“

”مثلاً........ کیا پچھتائے گا؟“ وکیلِ استغاثہ نے ڈرامائی انداز میں سوال کیا۔ ”اس بات سے ملزم کا مقصد کیا تھا؟ اور........ اور جب وہ یہ الفاظ ادا کر رہا تھا تو اس کے چہرے پر کس قسم کے تاثرات تھے؟“

استغاثہ کے گواہ مقام خان نے ایک ہلکی پھلکی جھرجھری لی اور وکیل استغاثہ کے استفسار کے جواب میں بتانے لگا۔

”جناب! ملزم کا چہرہ اس وقت غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں بڑے خطرناک تاثرات تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے تو یہ ڈر محسوس ہوا کہ اگر اسے روکا نہ گیا تو آج میرے ہوٹل میں کوئی سنگین واردات ضرور ہو گی، اسی لئے میں نے آگے بڑھ کر ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ ان کے دوسرے ساتھیوں نے بھی اس سلسلے میں بڑی مدد کی تھی۔“

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”اور جناب! اس بندے نے بڑے واضح الفاظ میں مقتول سے کہا تھا........ عارف! مجھ سے زیادہ نہیں اُلجھو۔ تم نہیں جانتے، میں کتنا خطرناک آدمی ہوں۔ تمہارے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔“

”اور پھر اس کے کچھ دن بعد ہی عارف کا قتل ہو گیا۔“ وکیلِ استغاثہ نے ٹکڑا لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہے نا؟“

”جی........ جی ہاں........!“ مقام خان نے متذبذب انداز میں گردن ہلائی۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔

”اس سے تو ظاہر ہوتا ہے........ ملزم نے اس روز آپ کے ہوٹل میں مقتول کو خالی خولی دھمکی نہیں دی تھی...... بلکہ چند روز بعد، اس نے اپنی دھمکی پر عمل بھی کر دکھایا تھا.....“

وکیلِ استغاثہ نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو مقام خان نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”جی ہاں........ جی ہاں........!“

وکیل استغاثہ نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

”جنابِ عالی! مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔“

اس کے بعد، میں جج کی اجازت سے گواہ والے کٹہرے کے پاس چلا آیا۔ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے ٹٹولنے والے انداز میں استغاثہ کے گواہ کی طرف دیکھا۔ میرے اس دیکھنے نے اسے نروس کر دیا۔ وہ جلدی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ یہ پہلو بدلنا ایک اضطراری عمل تھا، جس میں اس نے اپنے جسم کے وزن کو ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں پر منتقل کیا تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”خان صاحب! یہ آپ کے ہوٹل کا نام کچھ عجیب سا نہیں ہے........ رنگین ہوٹل؟“

”آپ کو عجیب لگ رہا ہے تو ہم کیا کر سکتا ہے؟“ وہ برہمی سے بولا۔ ”اب آپ ہمارے نام پر بھی اعتراض کرو گے، وکیل صاحب!“

”مقام خان!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ کے اور آپ کے ہوٹل کے نام پر مجھے قطعاً کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ ”رنگین ہوٹل“ کچھ عجیب سا نام ہے۔ خیر........“ میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”آپ یہ رنگین ہوٹل کتنے عرصے سے چلا رہے ہیں؟“

”عرصہ........ بیس سال سے زیادہ ہو گیا ہے!“ اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔

"مقام خان! وکیلِ استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں آپ نے بتایا ہے کہ آپ ملزم کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیا آپ مجھے اس کے والدین کے نام بتا سکتے ہیں؟"

"او........وکیل صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہو۔" وہ اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کوئی ہمارا رشتے دار ہے جو ہم اس کے ماں باپ اور خاندان والوں کے نام جانتے ہوں؟"

"کمال میں نہیں، آپ کر رہے ہیں، خان صاحب!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا۔ "ایک طرف آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ ملزم کو بڑی اچھی طرح جانتے ہو اور دوسری جانب آپ اس بات کے ثبوت سے صاف انکار کر رہے ہو........ ہے نا کمال کی بات؟"

"وکیل صاحب! آپ شاید ہماری بات سمجھ نہیں سکا۔" وہ کسی مفکر کے انداز میں بولا۔ "ہمارا یہ مطلب نہیں تھا، جو آپ نے نکالا ہے۔"

"پھر اس دعوے سے آپ کی کیا مراد تھی؟" میں نے تفریح لینے والے انداز میں کہا۔ "آپ مجھے آسان الفاظ میں سمجھا دیں۔"

اس نے خفگی آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔

"ہمارے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ بندے روزانہ صبح ہمارے ہوٹل میں چائے پینے آتے تھے۔ میں روزانہ ان کو دیکھتا تھا، اس لئے کہہ دیا کہ ہم ان کو اچھی طرح جانتا ہے۔ بس، اتنی سی بات ہے۔"

اس وضاحت کا بہت بہت شکریہ، خان صاحب!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا، پھر سوال کیا۔ "مقام خان! تھوڑی دیر پہلے، وکیل استغاثہ کے استفسار پر آپ نے معزز عدالت کے سامنے وہ تفصیل بیان کی ہے، جب ملزم اور مقتول میں سنگین نوعیت کا جھگڑا ہوا تھا۔ اس جھگڑے کا سبب کوئی عورت تھی اور........آپ نے بڑے وثوق سے کہا ہے کہ آپ کو شک تھا، ایک دن ضرور ایسا ہوگا۔ آپ کو یہ پیشگی شک کس بنیاد پر تھا؟"

"ان لوگوں کی باتیں سن کر ہم کو ایسا لگا تھا۔" مقام خان نے جواب دیا۔

"باتیں سن کر........؟" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "ہاں، یاد آیا........آپ

نے معزز عدالت کو یہ بھی بتایا ہے کہ یہ لوگ چائے پینے کے دوران بڑی تیز آواز میں باتیں کرتے تھے اور بات بات پر قہقہے بھی لگاتے تھے۔ ذرا یہ قصہ بھی تو بتائیں۔"

ابھی میں نے معزز عدالت کے حوالے سے جو بات کی ہے، ایسا گواہ نے کچھ نہیں کہا لیکن میں نے چونکہ بڑی سنجیدگی سے یہ چال چلی تھی، اس لئے وہ میرے چکر میں آ گیا اور بڑے رازدارانہ انداز میں بولا۔

"وکیل صاحب! ہمارا دادا سمندر خان، ہمارے باپ دریا خان سے کہا کرتا تھا کہ جب مرد لوگ بیٹھ کر آپس میں عورت کا بات کریں تو ان میں بہت جلد فساد پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ بھی عورت ذات کے بارے میں بڑی خطرناک باتیں کرتے تھے، جس سے مجھے لگتا تھا کہ ان میں کسی دن ضرور جھگڑا ہوگا۔"

میں نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "خان صاحب! ذرا ان خطرناک باتوں کی وضاحت تو کریں، جنہوں نے آپ کو شک میں ڈال رکھا تھا؟"

استغاثہ کے گواہ اور رنگین ہوٹل کے مالک مقام خان نے میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے باری باری جج اور وکیلِ استغاثہ کی جانب ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ کسی حوالے سے متذبذب ہو۔ اس کی ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مقام خان! کسی جھجک، مصلحت یا ڈر خوف کی ضرورت نہیں۔ آپ کے دل اور ذہن میں جو کچھ بھی ہے، اسے بلا تردد زبان پر لے آؤ۔"

جج نے اس کی ہمت بندھائی تو وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔

"یہ لوگ اکثر کسی اسکول کی مس لوگوں کا باتیں کرتے تھے اور وہاں پڑھنے والے بچوں کی ممی لوگوں پر تبصرہ کرتے رہتے تھے۔ وہ کیسی ہے، یہ کیسی ہے۔ وہ ادھر سے خوب صورت ہے، یہ ادھر سے قیامت ہے، اس کی چال بڑی پُرکشش ہے، اس کا انداز بڑا خطرناک ہے........وغیرہ وغیرہ۔"

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔

"وکیل صاحب! اتنے دنوں میں مجھے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ ان چاروں کے بچے کسی قریبی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ یہ لوگ اسی اسکول کی ٹیچر لوگوں اور وہاں اپنے

بچوں کو چھوڑنے آنے والی ماؤں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں، لیکن بڑے بازاری انداز میں۔ سچ پوچھیں تو ان کی باتیں اور تبصرے سن کر مجھے بڑی شرم آتی تھی۔ ان میں جو اخبار والا ہے نا، وہ سب سے زیادہ شیطان اور آوارہ لگتا ہے۔ وہ عورت کے حوالے سے ایسی گندی گندی باتیں کرتا تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا......بس، بڑی فحش اور غلیظ باتیں ہوتی تھیں اس کی۔"

"اور آپ......!" وہ خاموش ہوا تو میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "خان صاحب! آپ ان فحش، گندی، بے ہودہ اور شرم ناک باتوں کو بڑے غور...... بلکہ بڑے مزے سے سنتے تھے...... ہے نا؟"

"وہ......وہ جناب......!" میرے استفسار نے اسے گڑبڑا دیا۔ "جناب! کوئی اپنے کان تو بند نہیں کر سکتا نا...... ویسے میں خاص طور پر نہیں سنتا تھا۔ باتیں خود ہی میرے کانوں تک پہنچ جاتی تھیں اور......!"

"مقام خان!" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اسے مخاطب کر لیا اور نہایت ہی سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "کیا آپ مسلمان ہیں؟"

"الحمدللہ!" وہ بڑی کراری آواز میں بولا۔ "ہم بڑا پکا مسلمان ہے۔"

"ایک مسلمان ہونے کے ناتے پھر تو آپ کو یہ بھی پتہ ہوگا......" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "کسی کی باتوں پر کان لگانا کتنا بڑا گناہ ہے اور...... باتیں بھی گندی گندی، بے غیرتی کی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے والے کے لئے کتنے دردناک عذاب کی بات کی ہے!"

مقام خان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں واضح طور پر اندازہ نہ لگا سکا کہ وہ رنگ خوفِ خدا کا تھا یا احساسِ ندامت کا۔ بہرحال، وہ تھوڑا ہلا ضرور تھا، قدرے پریشان لہجے میں بولا۔

"اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں، وکیل صاحب! ہم اپنے کان بند کر سکتا ہے اور نہ ہی لوگوں کی زبان۔ اس سلسلے میں ہم نے اپنا فرض پورا کر رکھا ہے۔"

اس کے آخری جملے نے مجھے چونکا دیا۔ میں ترت پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"کیسا فرض، خان صاحب؟"

اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

"ہم نے اپنے ہوٹل کی چاروں دیواروں پر یہ لکھوایا ہوا ہے...... "ہوٹل میں بیٹھ کر فضول باتیں نہ کریں اور سیاسی گفتگو بھی ممنوع ہے۔" اب لوگ اس ہدایت کو پڑھ کر بھی باز نہ آئیں تو ہم کیا کر سکتا ہے۔"

بات کے اختتام پر اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ میں نے کہا۔

"آپ صرف جلدی جلدی میرے سوالات کے جواب دیں۔ اس کے علاوہ آپ کو اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سوالات میں تیزی لاتے ہوئے پوچھا۔

"مقام خان! آپ بڑی توجہ سے عورتوں، مس لوگوں اور ممی لوگوں کے بارے میں ان چاروں کی باتیں سنتے رہے ہیں۔ ذرا سوچ کر بتائیں، ان کی گفتگو میں کبھی شرمین نامی عورت کا بھی تذکرہ ہوا؟ انہوں نے اس عورت کے بارے میں بھی اُلٹے سیدھے تبصرے کئے کبھی؟"

اس کے چہرے پر کچھ اس نوعیت کے تاثرات اُبھرے جیسے اچانک اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ پھر وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اس عورت کا ذکر اس دن ہوا، جب ملزم اور مقتول کے درمیان جھگڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں نے اس عورت کا نام بھی نہیں سنا تھا...... اب مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ عورت کسی فیصل صاحب کی بیوی ہے۔"

"آپ کو بالکل ٹھیک پتہ چلا ہے۔" میں نے اپنی جرح کو اختتام کی جانب لاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں معزز عدالت کو بتایا ہے کہ اس روز آپ کے ہوٹل میں ہونے والے جھگڑے کے دوران ملزم نے مقتول کو خطرناک دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا...... عارف! مجھ سے نہیں اُلجھو، تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ تمہارے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ اس واقعے کے چند روز بعد عارف قتل ہو گیا۔"

میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کا خیال ہے کہ ملزم نے مقتول کو کوئی خالی خولی دھمکی نہیں دی تھی، بلکہ اس نے اپنے کہے پر عمل بھی کر دکھایا۔ آپ ان الفاظ کا مطلب سمجھتے ہیں؟"

مقام خان نے اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔ "یہ تو بالکل سادہ الفاظ ہیں۔ ان میں ایسی کون سی مشکل بات ہے؟"

"بات واقعی مشکل نہیں...... بلکہ آسان ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور ان الفاظ کا واضح مطلب یہی ہے کہ ملزم نے اپنی دھمکی پر عمل کرتے ہوئے مقتول کو قتل کر ڈالا۔ آپ نے وکیلِ استغاثہ کے استفسار کے جواب میں بڑے مضبوط انداز میں اس کی تصدیق کی ہے، جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ آپ اس امر پر یقین رکھتے ہیں۔ یعنی آپ بھی استغاثہ کی طرح میرے مؤکل کو عارف کا قاتل سمجھتے ہیں؟"

"جناب! حالات تو یہی کہہ رہے ہیں۔"

"آپ حالات کو چھوڑیں۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "اپنی بات کریں۔ کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے یہ قتل ہوتے دیکھا ہے؟"

"نہیں جناب! میں نے ایسا کچھ نہیں دیکھا۔" وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔

"تو کیا آپ کو کسی ایسے شخص نے اس واردات کے بارے میں بتایا ہے، جس نے اپنی آنکھوں سے قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟" میرا لہجہ لحہ بہ لحہ درشت ہوتا جا رہا تھا۔

"ن...... نہیں......" وہ گڑبڑا گیا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"آپ نے عارف کو قتل ہوتے یا وسیم کو قتل کرتے نہیں دیکھا۔ ملزم اور مقتول سے منسوب اس خونیں واقعے کے بارے میں آپ کو کسی عینی شاہد نے بھی نہیں بتایا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس واقعے کی تصدیق یا تردید کرنے کا قرار واقعی حق نہیں رکھتے۔ پھر کس برتے پر آپ نے وکیل استغاثہ کے استفسار پر بڑی شرافت سے صاد کیا ہے؟ آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میرا مؤکل، مقتول عارف کا قاتل ہے، جو آپ اس کے خلاف گواہی دینے عدالت تک چلے آئے؟"

میرے پے در پے سوالات نے استغاثہ کے گواہ مقام خان کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ وہ

قدرے نروس لہجے میں بولا۔

"جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ پولیس اس کیس کی انکوائری کرتے ہوئے ہمارے ہوٹل پر آئی تھی۔ ان ہی سے مجھے پتہ چلا کہ ایسی کوئی واردات ہوئی ہے۔ یہ لوگ چونکہ ہمارے ہوٹل میں آ کر بیٹھتے تھے اور کچھ دن پہلے ملزم اور مقتول میں شدید نوعیت کا جھگڑا بھی ہوا تھا، جس میں ملزم نے مقتول کو خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی۔ اس لئے ہمیں یقین آ گیا کہ ایسا ہی ہوا ہو گا۔" وہ سانس درست کرنے کے لئے تھما، پھر اپنی وضاحت کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"پولیس نے ہم سے ان کے جھگڑے کے بارے میں بہت سوال کئے، پھر کہا کہ ہمیں گواہی کے لئے عدالت میں پیش کرنا ہو گا اور ہم عدالت میں آ گیا۔ یہاں جو کچھ ہوا، وہ آپ کے سامنے ہے۔"

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"گویا...... آپ اپنے طور پر اس کیس کے بارے میں براہِ راست کچھ نہیں جانتے۔ پولیس نے آپ کو جو معلومات فراہم کیں، آپ کی گواہی کا دارومدار اسی پر ہے۔ آپ دعوے سے نہیں کہہ سکتے کہ میرے مؤکل نے مقتول عارف کو قتل کیا ہے۔ یہ سب کچھ آپ پولیس کے کہنے پر بیان کر رہے ہیں۔"

"جی......" وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ "بالکل یہی بات ہے۔"

"مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا، جنابِ عالی!" میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کراری آواز میں کہا اور جرح موقوف کر دی۔

جج نے عدالت کے کمرے میں موجود دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ عدالت کا مخصوص وقت ختم ہونے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ ظاہر ہے، اس قلیل مدت میں کسی اور گواہ کو شہادت کے لئے پیش نہیں کیا جا سکتا تھا، لہٰذا جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

اگلی پیشی پندرہ روز بعد تھی۔

●......●......●

آئندہ پیشی سے پہلے ہما سے میری دو ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ اب تک کی میری

کارکردگی سے مطمئن تھی۔ کچھ نئی باتیں بھی سامنے آئی تھیں۔ حالات کی بدلتی ہوئی کروٹ نے اس کیس کے چند نئے زاویے اُجاگر کئے تھے، جو وسیم کے بے گناہ ہونے پر روشنی ڈالتے تھے۔ میں نے خود بھی مقتول کے محلے میں جا کر اِدھر اُدھر سے تھوڑی تفتیش کی تھی، لیکن یہ ظاہر کئے بغیر کہ میں اس کیس میں وکیلِ صفائی کا کردار ادا کر رہا ہوں۔ فیصل اور شرمین کا گھر مقتول سے دو گلیوں کے فاصلے پر تھا، چنانچہ میں نے اپنی تحقیق و تفتیش کو وہاں تک پھیلا لیا تھا۔ میری یہ غیر محسوس کوشش خاصی مفید ثابت ہوئی تھی۔

شاید میں ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا کہ مقتول عارف کی موت، چوبیس نومبر کی سہ پہر اس کے گھر پر واقع ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول کی موت کا وقت سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔ مقتول کو سینے میں خنجر گھونپ کر بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا۔

اس پیشی پر پہلے استغاثہ کے دو ایسے گواہوں کو عدالت میں پیش کیا گیا، جن کے بیانات اور ازاں بعد ان پر ہونے والی جرح میں کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی، جس کا خاص طور پر ذکر کیا جائے۔ لہٰذا میں خاموشی سے آگے بڑھتا ہوں۔

اگلی گواہی مقتول کی بیوہ سلمٰی کی تھی۔ اس نے مختصر سا بیان ریکارڈ کر دیا تو وکیل استغاثہ نے اسے گھیر لیا۔ وہ آدھے گھنٹے تک مختلف انداز میں سلمٰی سے سوالات کر کے ملزم کے خلاف نفرت کی دیواریں اُٹھاتا رہا۔ میں نے کوئی آبجیکشن کئے بغیر خاموشی سے اُس کی آتشیں اور زہریلی تقریریں سنی، پھر اپنی باری پر جج سے اجازت حاصل کر کے میں استغاثہ کی گواہ کے قریب چلا گیا۔ میں نے وٹنس باکس میں کھڑی سلمٰی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

”سلمٰی بی بی! مجھے آپ کے شوہر کی ناگہانی موت کا بڑا دکھ ہے۔ اگر اور کوئی موقع ہوتا تو میں تعزیت کے الفاظ کے علاوہ آپ سے ایک سوال بھی نہ کرتا۔ لیکن یہاں مجبوری ہے، مجھے آپ پر جرح کرنا ہوگی...... آپ سچویشن کو سمجھ سکتی ہیں۔“

”جی...... میں سمجھ رہی ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟ میں آپ کے سوالات کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو کر آئی ہوں۔“

”بہت بہت شکریہ آپ کا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا، پھر پوچھا۔ ”آپ کی فیملی کُل کتنے افراد پر مشتمل ہے؟“

”پہلے ہم تین افراد تھے۔“ اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”اب صرف دو رہ گئے ہیں۔ میں اور میرا بیٹا۔“

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، آپ کے شوہر کی موت چوبیس نومبر کی سہ پہر چار اور پانچ بجے کے قریب آپ کے گھر پر واقع ہوئی تھی۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مقتول کی لاش کو آپ نے لگ بھگ ساڑھے پانچ بجے دریافت کیا تھا۔ کیا وقوعہ کے وقت آپ گھر پر موجود نہیں تھیں؟“

”جی نہیں...... میں ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھی۔“ اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اپنا الٹرا ساؤنڈ کرانے کے لئے لیڈی ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ چار بجے کا اپائنٹمنٹ تھا، لیکن وہاں بہت دیر لگتی تھی، اس لئے ہم ساڑھے تین بجے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ عارف مجھے کلینک میں چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ وہ گھر میں تھوڑا آرام کرنا چاہتا تھا، تاکہ شام میں دوبارہ کام کے لئے نکل سکے۔“

جیسا کہ کہانی کی ابتدا میں بتایا جا چکا ہے، مقتول کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا، جہاں سے وہ دوپہر کے بعد چھٹی کر کے گھر آ جایا کرتا تھا، پھر شام میں وہ پارٹ ٹائم مارکیٹنگ وغیرہ کے کام کے لئے نکلا کرتا تھا۔ میں نے سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے مقتول کی بیوہ سلمٰی سے پوچھا۔

”آپ کی گلی میں، آپ کے گھر کے عین سامنے ایک جنرل اسٹور ہے۔ کیا آپ اس کا نام بتا سکتی ہیں؟“

”خالد جنرل اسٹور۔“ اُس نے ایک لمحہ سوچے بغیر جواب دیا۔

میں نے اگلا سوال کیا۔

”اللہ آپ کا بھلا کرے۔ جنرل اسٹور کے ایک پہلو میں بلکہ اس کے قدموں میں ایک پان سگریٹ کی بھی چھوٹی سی دکان ہے۔ برائے مہربانی اس کا نام بھی بتا دیں؟“

وہ ایک مرتبہ پھر بڑے اعتماد سے بولی۔ ”خورشید پان ہاؤس۔“

”آبجیکشن یور آنر!“ وکیل استغاثہ نے نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے کہا۔

''میرے فاضل دوست اوٹ پٹانگ قسم کے سوالات پوچھ کر خوامخواہ عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ یہ عارف مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔ اس کیس کی جرح کے دوران جنرل اسٹور اور پان ہاؤس کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ وکیلِ صفائی کو ایسے غیر متعلقہ سوالات سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

''آپ کیا کہتے ہیں، بیگ صاحب؟'' جج نے چشمے کے اوپر سے دیکھتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا، پھر کہا۔

''جنابِ عالی! مقتول کی بیوہ سے اس کی گلی اور گھر کا احوال پوچھ رہا ہوں۔ یہ باتیں اوٹ پٹانگ اور غیر متعلق کیسے ہو سکتی ہیں؟''

''تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ خالد جنرل اسٹور اور خورشید پان ہاؤس کا اس کیس کے ساتھ گہرا تعلق ہے؟'' جج نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''یس سر......!'' میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''اور میں آگے چل کر اس تعلق کو معزز عدالت کے روبرو ثابت بھی کرنے والا ہوں۔''

حاضرینِ عدالت میں سرگوشیانہ نوعیت کی چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ انکوائری آفیسر اور وکیل استغاثہ کے چہروں پر مجھے اُلجھن کے آثار نظر آئے۔ میں ان پر ایک استہزائیہ نگاہ ڈالنے کے بعد جج کی طرف دیکھنے لگا۔

جج نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''اوکے......بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

میں کٹہرے میں کھڑی سلمٰی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''سلمٰی صاحبہ! وقوعہ کے روز آپ اپنے بیٹے اور شوہر کے ساتھ، ساڑھے تین بجے سہ پہر جس لیڈی ڈاکٹر کے پاس الٹرا ساؤنڈ کرانے گئی تھیں، اس کا نام کیا ہے؟''

''ڈاکٹر کا نام فضیلہ اور الٹرا ساؤنڈ کلینک کا نام ''خان الٹرا ساؤنڈز'' ہے۔'' سلمٰی نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔

''مقتول نے ساڑھے تین بجے سہ پہر آپ کو ''خان الٹرا ساؤنڈز'' پر پہنچایا اور پھر واپس گھر آ گیا۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی

رپورٹ کے مطابق، مقتول کی موت سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ کلینک آپ کے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں؟''

''جی، اس کا یہی مطلب ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ کلینک ڈاک خانے کے اسٹاپ پر ایک گلی میں واقع ہے۔''

''جب آپ اپنے بیٹے کے ساتھ کلینک سے واپس آئیں تو لگ بھگ ساڑھے پانچ کا وقت تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور گھر کے اندر شوہر کی لاش نے آپ کا استقبال کیا۔ کسی شقی القلب شخص نے سینے میں خنجر گھونپ کر اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ''حالات اسی ڈھنگ سے پیش آئے تھے۔''

''ذرا سوچ کر بتائیں۔'' میں نے سلمٰی کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ بات کس کس کو معلوم تھی کہ مقتول ساڑھے تین بجے سے ساڑھے پانچ بجے تک گھر میں اکیلا ہو گا؟''

''میں نے تو کسی کو نہیں بتایا تھا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

''یہی سوال میں دوسرے زاویے سے کرتا ہوں۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات کس کس کے علم میں تھی کہ انہی اوقات کے دوران آپ اپنے بچے کے ہمراہ ''خان الٹرا ساؤنڈ کلینک'' میں موجود تھیں؟''

''کسی کو بھی نہیں......آں......'' وہ بولتے بولتے رُک گئی۔

میں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا کہ اچانک اس کے ذہن میں کوئی نہایت ہی اہم پوائنٹ اُبھرا تھا، جبھی ''آں'' کے ساتھ ہی اُس کی بولتی کو بریک لگ گئے تھے۔

میں نے حوصلہ دلانے والے انداز میں کہا۔

''لگتا ہے، میرے سوال کا جواب آپ کو معلوم ہے، لیکن آپ کسی خاص وجہ سے رک گئے ہیں۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند کریں گی کہ وہ خاص وجہ کیا ہے؟''

''مجھے تھوڑی دیر پہلے تک، آپ کے سوال کے جواب میں بتانے کے لئے کچھ بھی

معلوم نہیں تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''لیکن ابھی ابھی میرے ذہن میں روشنی کی ایک کرن سی چمکی ہے اور........'' وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوئی، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''جب عارف مجھے کلینک پر چھوڑ کر گیا تھا تو میں نے فیصل اور اس کی بیوی شرمین کو کلینک میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ چند روز پہلے والے ناخوش گوار واقعے کی وجہ سے ہمارے درمیان خاصا تناؤ آ گیا تھا، لہٰذا علیک سلیک کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر دوسری جانب منہ پھیر لیا تھا۔ عارف والے واقعے کی وجہ سے وہ ہم سے نفرت کرنے لگی تھی۔''

''شرمین نے دوسری جانب منہ پھیر لیا تھا۔'' میں نے اسی کے الفاظ کو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ نے بھی ان میاں بیوی کو نظرانداز کر دیا تھا؟''

''نہیں۔'' اس نے قطعی انداز میں گردن کو نفی میں جنبش دی۔ ''مجھے ان لوگوں سے چونکہ کوئی گلہ شکوہ نہیں تھا، لہٰذا میں وقفے وقفے سے انہیں دیکھتی رہی تھی اور دل ہی دل میں شرمندہ بھی ہوتی رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شرمین ایک خوب صورت اور دلکش عورت ہے۔ میری شرمندگی کا سبب عارف کی وہ حرکت تھی، جسے بیان کرنا........ میرے خیال میں ضروری نہیں۔''

''بالکل ضروری نہیں۔ کیونکہ اس وقت ہمیں اس افسوس ناک واقعے سے بھی زیادہ اہم اور سنگین معاملات درپیش ہیں۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا، پھر پوچھا۔

''سلمٰی صاحبہ! آپ لگ بھگ سوا پانچ بجے تک اس کلینک میں موجود رہی تھیں۔ ذرا سوچ کر بتائیں، کیا اس دوران شرمین بھی وہاں موجود رہی تھی یا اس کا نمبر آپ سے پہلے آ گیا تھا؟''

''نمبر پہلے کیسے آ سکتا تھا؟'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں پہلے پہنچی تھی تو میرا نمبر ہی پہلے آنا تھا۔ شرمین نے میرے بعد ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔''

''یعنی جب آپ کلینک سے نکلیں تو شرمین وہاں موجود تھی؟''

''جی........ بالکل!'' اس نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

''اور اس کا شوہر؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو اُسے کلینک پہنچانے کے تھوڑی دیر بعد چلا گیا تھا۔''

''دیٹس آل یور آنر!'' میں نے باآواز بلند کہا۔ ''مجھے استغاثہ کی گواہ اور مقتول کی بیوہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

''دی کورٹ از ایڈجارنڈ۔'' جج نے عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

آئندہ پیشی دس روز بعد تھی۔



منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں شرمین کا شوہر فیصل کھڑا تھا۔ مقتول کی ''حرکت'' نے براہِ راست شرمین اور فیصل کو متاثر کیا تھا اور جب یہ بات کھلی کہ عارف نے یہ حرکت وسیم کے اُکسانے پر کی تھی تو ان میاں بیوی کو وسیم سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ چنانچہ استغاثہ نے شرمین کے شوہر کو اپنے گواہوں کی فہرست میں شامل کر لیا تھا، تاکہ ملزم کے کردار پر زیادہ سے زیادہ تھوتھو کی جا سکے۔

فیصل کی عمر چالیس کے قریب رہی ہو گی۔ وہ پاسپورٹ آفس میں کسی معمولی عہدے پر فائز تھا۔ جسم دُبلا پتلا اور قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا۔ اس صحت کے باعث اسے کمر کو تھوڑا سا جھکا کر کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ اس نے ہٹلر مارکہ مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں اور نظر کا خاصا موٹا چشمہ لگاتا تھا۔

فیصل نے سچ بولنے کا حلف اُٹھایا اور اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیلِ استغاثہ جرح کے لئے اس کے پاس پہنچ گیا۔ وکیلِ استغاثہ مختلف انداز میں فیصل کے منہ سے ملزم کے خلاف نفرت کی چنگاریاں چھڑاتا رہا۔ فیصل کے مطابق، عارف نے اس کی بیوی شرمین کے ساتھ جو نازیبا حرکت کی تھی، اس کے پیچھے وسیم کا شیطانی ذہن کارفرما تھا، لہٰذا اسے وسیم کے خلاف بڑھ چڑھ کر بولنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں تھا۔

وکیلِ استغاثہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے گواہ کے منہ سے جو کچھ اُگلوا رہا تھا، اس کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن میں استغاثہ کے گواہ فیصل کے ساتھ جو کرنا چاہتا تھا، اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔

اپنی باری پر میں وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا اور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔ یہ میرا مخصوص ہلکا پھلکا انداز تھا، جسے مخالفین مکڑی کا جالا کہتے

تھے۔

"فیصل صاحب! آپ کا ذریعہ معاش کیا ہے؟"

"میں پاسپورٹ آفس میں جاب کرتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ "یعنی سرکاری نوکری؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"پھر تو آپ کی جلد چھٹی ہو جاتی ہوگی۔" میں نے تصدیق طلب انداز میں کہا۔

"آپ عموماً کتنے بجے گھر پہنچ جاتے ہیں؟"

"زیادہ سے زیادہ چار بجے تک۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے گھیرا تنگ کرنے کے لئے سوالات کے زاویے کو تھوڑا سا تبدیل کر دیا اور کٹہرے میں کھڑے استغاثہ کے گواہ سے سوال کیا۔

"فیصل صاحب! مقتول کی موت سے چند روز قبل، آپ کی بیوی کے حوالے سے ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا، جس کے نتیجے میں آپ کو مقتول سے شدید ترین نفرت ہوگئی تھی اور آپ کا یہ عمل عین فطری بھی تھا۔ لیکن آج استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہو رہی ہے۔ آپ کے اس عمل کا تو سیدھا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو مقتول کی ذات سے نفرت نہیں بلکہ گہری ہمدردی ہے۔ اپنے اس رویّے کی تھوڑی وضاحت کریں گے؟"

"اس کی وضاحت بہت سیدھی اور آسان ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ مقتول کی حرکت سے میری بڑی دل آزاری ہوئی تھی۔ میں تو اسے اپنا گہرا دوست سمجھتا تھا۔ اسکول میں روزانہ ہماری ملاقات ہوتی تھی، بہر حال......"

وہ سانس درست کرنے کے لئے ذرا متوقف ہوا، پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"مقتول نے جو کیا، سو کیا۔ لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ اس بے وقوف نے یہ سب کچھ ملزم کے اُکسانے پر کیا تھا تو یقین کریں، میں نے مقتول کو دل سے معاف کر دیا۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس شیطان نے......" اس نے کٹہرے میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کیا اور اضافہ کرتے ہوئے بڑے جوشیلے انداز میں کہا۔ "اس ظالم

شخص نے مقتول کو معاف نہیں کیا۔"

"آپ نے مقتول کو دل سے معاف کر دیا، اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ "اور ملزم نے جو اچھا برا کیا، وہ خود بھگتے گا۔"

"اچھا نہیں......اُس نے برا ہی برا کیا۔" اس نے ایک مرتبہ پھر ملزم کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے گواہ کے اصرار کو نظر انداز کرتے ہوئے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھا دیا۔

"فیصل صاحب! آپ عموماً چار بجے تک گھر آ جاتے ہیں۔ ذرا سوچ کر جواب دیں......کیا وقوعہ کے روز بھی آپ چار بجے ہی گھر پہنچے تھے؟" میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کیا۔

"وقوعہ کے روز یعنی چوبیس نومبر......بروز پیر؟"

"اس دن میں دو بجے گھر آ گیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"اس کی کوئی خاص وجہ؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا۔

"اس روز مجھے اپنی بیوی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جانا تھا، اس لئے میں ذرا جلد گھر آ گیا تھا۔"

"ڈاکٹر فضیلہ کو دکھانے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "خان الٹرا ساؤنڈ کلینک پر؟"

"جی ہاں....." اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ "آپ کو کس نے بتایا؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور استفسار کیا۔

"فیصل صاحب! آپ اس روز کتنے بجے خان الٹرا ساؤنڈ کلینک پہنچے تھے؟"

"لگ بھگ ساڑھے تین بجے۔" اس نے بتایا۔ "اور میں چھ بجے تک وہیں کلینک پر ہی رہا تھا۔"

"کیا میں نے آپ سے یہ پوچھا کہ آپ وہاں کب تک رہے تھے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ن...... نہیں......" وہ گڑبڑا گیا۔ "میں نے یہ سوچ کر بتا دیا کہ اب آپ یہی سوال کریں گے۔"

"فیصل صاحب! آپ کی سوچ میرے سوال تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ پھر پوچھا۔ "کیا یہ صحیح ہے کہ اسی روز مقتول اور اس کی بیوی سلمیٰ بھی خان الٹرا ساؤنڈ کلینک پر پہنچے تھے؟"

"جی...... میں نے انہیں وہاں دیکھا تو تھا۔" جواب دینے کے بعد وہ اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔

"فیصل صاحب! صرف آپ نے ہی نہیں، بلکہ انہوں نے بھی آپ کو وہاں دیکھا تھا۔ خاص طور پر مقتول کی بیوی سلمیٰ نے۔"

"جی...... ظاہر ہے، انہوں نے بھی ہمیں دیکھا ہوگا۔ ڈاکٹر فضیلہ کا کلینک بہت چھوٹا سا ہے۔"

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے اگلا سوال کیا۔

"فیصل صاحب! وقوعہ کے روز آپ نے مقتول اور اس کی بیوی سلمیٰ کو خان الٹرا ساؤنڈ کلینک میں دیکھا، لیکن دونوں پارٹیوں میں کوئی دعا سلام نہیں ہوئی، بلکہ انہیں دیکھ کر آپ لوگوں نے منہ موڑ لیا تھا۔ جبکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے معزز عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کیا ہے کہ آپ نے مقتول عارف کو دل سے معاف کر دیا تھا۔ یہ کس قسم کی معافی تھی، جناب؟"

"میرا خیال ہے...... میں نے انہیں سلام کیا تھا۔" وہ گڑبڑا گیا۔ اس کے الفاظ میں دم نہیں تھا۔

"آپ کا خیال غلط ہے، فیصل صاحب!" میں نے جرح میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔ "مقتول کی بیوی سلمیٰ، استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے معزز عدالت کو بتا چکی ہے کہ وقوعہ کے روز آپ لوگوں نے انہیں کلینک میں دیکھ کر دوسری جانب منہ پھیر لیا تھا؟"

"پپ...... پتہ نہیں......" وہ لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سلمیٰ

نے...... یہ جھوٹ کیوں بولا؟"

"سلمیٰ نے معزز عدالت کو یہ بھی بتایا ہے کہ جب مقتول اسے کلینک میں چھوڑ کر گھر چلا گیا تھا تو آپ بھی اس کے پیچھے ہی کلینک سے باہر نکل گئے تھے۔" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں...... سلمیٰ کو مجھ سے کیا دشمنی ہے۔" وہ پریشانی سے بولا۔ "میں سمجھ نہیں پا رہا کہ اس نے عدالت کو ایسا بیان کیوں دیا؟"

"آپ کو سمجھانے کے لئے آپ کی بیوی کو عدالت میں بلانا پڑے گا، مسٹر فیصل!" میں نے سخت انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"کک...... کیا مطلب؟" وہ ہراساں نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"مقتول کی بیوہ نے تو آپ کے حوالے سے سراسر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اس بات کی تصدیق یا تردید آپ کی بیوی ہی کر سکتی ہے کہ وقوعہ کے روز آپ لوگوں نے ان لوگوں سے علیک سلیک کی تھی یا نہیں...... اور یہ کہ آپ مقتول کے پیچھے ہی کلینک سے باہر نکلے تھے یا نہیں......؟"

"ہاں...... مجھے یاد آ رہا ہے۔" اس نے بوکھلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ "میں تھوڑی دیر کے لئے کلینک سے باہر نکلا تھا، سگریٹ وغیرہ لینے کے لئے...... شاید یہ وہی وقت تھا، جب مقتول وہاں سے رخصت ہوا تھا...... اسی لئے مقتول کی بیوہ نے ایسی بات کی ہے۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "کیا تم کیپسٹن سگریٹ پیتے ہو؟"

میں یک لخت "آپ" سے "تم" پر آ گیا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"جی ہاں...... بالکل...... میں کیپسٹن سگریٹ کا پیکٹ لینے ہی تو کلینک سے باہر نکلا تھا۔"

"کیا آپ نے اُس روز سگریٹ کا پورا پیکٹ خریدا تھا یا محض ایک دو سگریٹ؟"

"پورا پیکٹ۔" اس نے جواب دیا۔ "میں ہمیشہ مکمل پیکٹ ہی خریدتا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔

''آپ ایک دن میں......یعنی چوبیس گھنٹے میں کتنی سگریٹ پھونک ڈالتے ہیں؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک پیکٹ۔'' اس نے بتایا۔

میں نے زاویہ تھوڑا سا تبدیل کرلیا۔

''مسٹر فیصل! آپ کا دعویٰ ہے کہ وقوعہ کے روز آپ ساڑھے تین بجے سے لے کر چھ بجے تک خان الٹرا ساؤنڈ میں موجود رہے تھے۔ اس دوران آپ ایک لمحے کے لئے بھی اِدھر اُدھر نہیں گئے تھے...... ہیں نا؟''

''جناب!'' وہ قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے کلینک کے اندر موجود رہنے کا دعویٰ نہیں کیا، البتہ یہ درست ہے کہ میں کہیں اِدھر اُدھر نہیں گیا تھا۔ میں سگریٹ خریدنے اور پینے کے لئے کلینک سے باہر گیا تھا۔''

''اور......اُس روز آپ اس قدر پریشان تھے کہ کلینک کے باہر کھڑے کھڑے آپ نے کیپسٹن کا پورا پیکٹ پھونک ڈالا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زہریلے انداز میں کہا۔

''بالکل غلط۔'' وہ ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا۔ ''میں کیوں پریشان ہونے لگا؟ میں ایک وقت میں کبھی ایک سگریٹ سے زیادہ نہیں پیتا...... پتہ نہیں، آپ یہ کس قسم کی باتیں کررہے ہیں؟''

بات ختم کر کے وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ گواہ کی اس کیفیت نے وکیل استغاثہ کو تشویش میں مبتلا کر دیا، لیکن میں اسی پر بس کرنے والا نہیں تھا۔ دام میں آئے ہوئے شکار کو چھوڑنا میری عادت نہیں تھی۔ میں نے گواہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

''مسٹر فیصل! تھوڑی دیر کے لئے۔ میں مان لیتا ہوں کہ وقوعہ کے روز تم بالکل بھی پریشان نہیں تھے۔ تم نے کلینک سے باہر کھڑے ہو کر ایک سے زیادہ سگریٹ نہیں پھونکی اور چھ بجے اپنی بیوی کے ہمراہ گھر آ گئے، لیکن......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا، پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''پیارے صاحب! ایسا مان لینے میں بڑی قباحت ہے۔''

''کیا قباحت ہے؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اگر اس روز تم واقعی پریشان نہیں تھے، کیپسٹن کا پورا پیکٹ نہیں پھونک ڈالا تھا اور تم ساڑھے تین بجے سے لے کر چھ بجے تک خان الٹرا ساؤنڈ کلینک کے اندر یا باہر موجود رہے تھے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لگ بھگ چار بجے سہ پہر، اسی روز تم نے خورشید پان ہاؤس سے کیپسٹن سگریٹ کا ایک پیکٹ اور سونف سپاری کیوں خریدی تھی؟''

''خورشید...... پان ہاؤس......'' آواز جیسے اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

''یہ...... پان ہاؤس...... کدھر ہے؟''

''مقتول کے گھر کے بالکل سامنے۔'' میں نے کراری آواز میں کہا۔ ''خالد جنرل اسٹور کے ساتھ۔''

''پپ...... پانی......!'' یہ کہتے ہوئے گواہ کٹہرے کے فرش پر بیٹھ گیا۔

میں نے فاتحانہ انداز میں جج کی طرف دیکھا اور باآوازِ بلند کہا۔

''مجھے استغاثہ کے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا...... اب یہ کیس انکوائری آفیسر کے حوالے ہے۔ وہ گواہ سے اقبالِ جرم کرائیں یا آزاد چھوڑ دیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں نے عدالت اور قانون کی نظر میں اس کیس کے ملزم اور اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کردیا ہے...... دیٹس آل یور آنر!''

جج نے مجھ سے پوچھا۔

''بیگ صاحب! آپ اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں کہ وقوعہ کے روز سہ پہر سوا چار بجے استغاثہ کا گواہ فیصل، مقتول کے گھر کے سامنے موجود تھا اور اس نے خورشید پان ہاؤس سے سگریٹ کا پیکٹ خریدا تھا؟''

میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

''جنابِ عالی! ویسے تو وٹنس باکس میں بیٹھے ہوئے استغاثہ کے معزز گواہ کی حالت ہی سے سب کچھ ظاہر ہو جاتا ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ عدالت میں ہر بات کو ثبوت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ لہٰذا میں نے عدالت کی اس ڈیمانڈ کا پورا پورا خیال

رکھا ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی، پھر ڈرامائی انداز میں دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''خورشید پان ہاؤس کا مالک خورشید عرف ماموں باہر برآمدے میں موجود ہے۔ میں نے صفائی کے گواہ کی حیثیت سے اسے یہاں بلایا ہے۔''

انکوائری آفیسر اور وکیل استغاثہ نے شک بھری نظروں سے مجھے دیکھا، پھر ان کی نگاہیں، جج کی نگاہ کے تعاقب میں دروازے کی جانب اُٹھ گئیں۔

●......●......●

اگلی پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل وسیم کو باعزت بری کر دیا۔ فیصل نے اقبالِ جرم کر کے اس کیس کی کارروائی کو اختتام تک پہنچا دیا تھا۔ عارف کو فیصل ہی نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

قاتل فیصل کے بیان سے یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ یہاں بھی اخباری رپورٹر حسان کے شیطانی ذہن نے بڑا فتنہ پھیلایا تھا۔ فیصل نے بتایا کہ اسے حسان ہی نے عارف اور وسیم کے خلاف بھڑکایا تھا۔ حسان کی باتوں میں آ کر اس نے ایک تیر دو شکار کے فارمولے پر عمل کر ڈالا۔ عارف کے لئے وہ اپنے دل میں اتنی نفرت رکھتا تھا کہ وہ اس کی جان لینے پر تیار ہوگیا۔ پھر جیسے ہی اسے موقع ملا، اس نے عارف کا کام تمام کر دیا اور ازاں بعد وسیم کے خلاف زہر اُگلنے کے لئے استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہوگیا۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا...... جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے!

حسان کا کردار شیطان سے کم نہیں تھا۔ اس نے ایسے ''سنگین مذاق'' کا اسکرپٹ تیار کیا کہ دو گھر اُجڑ کر رہ گئے اور اس خرابے کا اصل ذمہ دار صاف بچ نکلا۔

ویسے یہ حقیقت ہے کہ اگر شیطان ایسے کسی واقعے میں کام آ جائے تو پھر دنیا کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ وہ دنیا کی ابتدا سے ہے اور اس کے اختتام تک رہے گا۔ اللہ ہم سب کو اس کے شر سے محفوظ رکھے...... آمین!

●......●......●

سیاسی قتل

گزشتہ سال الیکشن کی بڑی گہما گہمی رہی۔ گزشتہ سے گزشتہ سال کے اختتامی دنوں میں ایک ایسا اندوہ ناک واقعہ پیش آیا کہ بلا تفریق جس نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا۔ دخترِ مشرق محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت نے ہر حساس دل کو ملول اور ہر آنکھ کو اشک بار کر دیا۔ اُفقِ سیاست کا ایک درخشندہ ستارہ غروب ہوا تو قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر اس عظیم نقصان کا سوگ منایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انتخابات کی گہما گہمی نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا۔

بہرحال، متذکرہ انتخابات کے ثمرات بھی سب کے سامنے ہیں۔ زیرِ نظر کہانی بھی چونکہ انتخابی یا انتخاباتی پس منظر لئے ہوئے ہے، اس لئے الیکشن دو ہزار آٹھ ذہن میں تازہ ہو گئے۔ واضح رہے کہ اس کہانی کا حالیہ الیکشن سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ کئی سال پہلے، ماضی کا ایک دلچسپ اور افسوس ناک واقعہ ہے۔

ایک روز میں حسبِ معمول اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ کاروباری زبان میں وہ دن خاصا مندی کا تھا۔ سہ پہر سے پہلے دو تین کلائنٹس آئے اور میں نے انہیں فارغ کر دیا۔ لگ بھگ پچھلے دو گھنٹے سے میں فرصت میں بیٹھا تھا۔ کلائنٹ تھا کہ ادھر جھانکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بہرحال، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ موت، کلائنٹ اور مصیبت کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ یہ دبے پاؤں دستک دیئے بغیر کسی وقت بھی آ جاتے ہیں۔ للہذا زندگی کی دکان اور دکان داری سجا کر ان کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

میں بھی انتظار کر رہا تھا اور اس انتظار کی کوفت دُور کرنے کے لئے میں نے اپنی

سیکرٹری کو چیمبر میں بلا لیا تھا۔ ثانیہ کو میں نے حال ہی میں اپائنٹ کیا تھا۔ ثانیہ ایک طرح دار اور حسین لڑکی تھی۔ اُس کے الفاظ میں ادائیں اور اداؤں میں گفتگو جھلکتی تھی۔

عام طور پر سننے میں یہی آیا ہے کہ حُسن اور عقل دو ایسے اوصاف ہیں، جو کسی ایک شخصیت میں بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ اور ثانیہ ایک ایسی ہی شخصیت تھی۔ اس سے بات کر کے، بحث کر کے دل و دماغ تازہ ہو جاتا تھا۔ ثانیہ کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا تھا، جن کی معیت میں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

ہمارے درمیان سیاست اور انتخابات کے موضوع پر ایسی گفتگو شروع ہوئی کہ پتہ ہی نہیں چلا اور دو گھنٹے بیت گئے۔ میں عموماً آٹھ ساڑھے آٹھ بجے دفتر سے اُٹھ جاتا ہوں۔ اس وقت سات بج رہے تھے۔ کلائنٹس کی ''بے مروّتی'' کے پیش نظر میں نے فیصلہ کیا کہ دفتر کو تالا لگا کر گھر کا رخ کروں۔ میں نے اپنے اس ارادے کا ثانیہ کے سامنے اظہار کیا تو اسے بھی اپنا ہم خیال پایا۔ وہ اس کارِ خیر کے لئے مجھ سے پہلے پَر کھولے بیٹھی تھی۔

میں نے کال بیل بجا کر آفس بوائے کو اپنے چیمبر میں بلا لیا۔ میں آفس سے اُٹھنے سے پہلے اسے چند ہدایات دینا چاہتا تھا۔ میرے آفس میں اوپری کام کرنے والے شخص کا نام قدیر احمد تھا۔ قدیر کی عمر چالیس کے قریب تھی۔ یہ ''آفس بوائے'' بھی بڑا دلچسپ اور عجیب عہدہ ہے۔ اس عہدے پر کام کرنے والا شخص ہمیشہ جوان بلکہ نوجوان رہتا ہے۔ اس کی عمر چاہے پچاس کا ہندسہ عبور کر جائے، وہ ''آفس بوائے'' ہی کہلاتا ہے۔

اگلے ہی لمحے قدیر احمد میرے چیمبر میں حاضر ہو گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''قدیر! لابی کی کیا صورتِ حال ہے؟''

''جناب! اونٹ کے منہ میں زیرے والی صورتِ حال ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

قدیر واجبی سا پڑھا لکھا تھا، لیکن خاصا سمجھ دار تھا۔ برمحل یا بے محل کا خیال کئے بغیر اسے محاورے وغیرہ استعمال کرنے کا بڑا شوق تھا۔ یا یہ سمجھیں کہ یہ عمل اس کی عادت میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ پچھلے پانچ سال سے میرے دفتر میں کام کر رہا تھا۔ میں تو فوراً

اس کے محاوروں کے مطالب تک رسائی حاصل کر لیتا تھا، لیکن جو بھی پہلی مرتبہ اس کا محاورہ سنتا، چند لمحات کے لئے گھوم کر رہ جاتا تھا۔

میں سمجھ تو گیا کہ وہ کسی کلائنٹ کی آمد کی خبر دے رہا تھا، لیکن محض تفریح کی خاطر میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''کیا کہہ رہے ہو بھائی؟ انتظار گاہ میں اونٹ اور گرم مسالے کا کیا کام؟''

''جناب! کسی جگہ پر اُلو بولنے سے تو اچھا ہے کہ اونٹ منہ میں گرم مسالا ڈالے بیٹھا رہے۔ زیرے والے اونٹ کے بارے میں، میں آپ کو بتانے ہی آ رہا تھا کہ آپ نے گھنٹی بجا کر مجھے اپنے پاس بلا لیا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ابھی ابھی ایک کلائنٹ آئی ہے۔ میں نے اسے لابی میں بٹھایا ہے۔''

''اگر تم نے اسے بٹھایا ہے تو تمہی اٹھاؤ گے بھی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اونٹ کو بٹھانا اور اٹھانا خاصا ٹیکنیکل کام ہے۔''

میں نے تھوڑا توقف کیا، پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''مطلب یہ کہ اس کلائنٹ بی بی کو فوراً میرے پاس بھیج دو۔''

''آپ کا حکم سر منہ پر جی۔'' اس نے کہا اور اُلٹے قدموں چیمبر سے نکل گیا۔

''یہ بندہ اُردو محاوروں کے ساتھ بڑی زیادتی کرتا ہے، بیگ صاحب!'' ثانیہ نے قدیر کے جانے کے بعد کہا۔

میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

''اگر اسے انگریزی آتی ہوتی تو بلا تکلف انگلش محاورہ جات کا بھی یونہی حلیہ خراب کر دیتا۔ ویسے ایک بات ہے، ثانیہ!... قدیر دل کا بہت اچھا اور انتہائی سادہ مزاج ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ''مجھے یہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا، میں نے اسے ایسا ہی پایا ہے، جیسا آپ بیان کر رہے ہیں۔''

اسی لمحے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ قدیر مذکورہ کلائنٹ کو لے کر آ گیا تھا۔ ثانیہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور عام سے لہجے میں بولی۔

"بیگ صاحب! آپ بسم اللہ کریں۔ کافی دیر کے بعد کوئی کلائنٹ ادھر آیا ہے۔ میں اپنی سیٹ پر جا رہی ہوں۔"

میرا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ وہ نہ جائے، لیکن میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے پاس آنے والے مجھ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہر شخص کے اپنے مسائل اور راز ہوتے ہیں، جو وہ دوسروں کے سامنے ڈسکس کرنا پسند نہیں کرتا اور یہ ہر کلائنٹ کا بنیادی حق بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا میں نے ثانیہ کو اپنے چیمبر میں مزید روکنے کی کوشش نہیں کی۔

ادھر ثانیہ چیمبر سے باہر نکلی، اُدھر میری کلائنٹ اندر داخل ہوئی۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ شکریہ ادا کرنے کے بعد ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے سوالیہ نظروں سے اپنے سامنے بیٹھی خاتون کو دیکھا اور کہا۔

"جی، فرمائیے........ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

اس کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان نظر آتی تھی۔ بعد ازاں میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ اس وقت اپنی عمر کی پچپن ویں سیڑھی پر کھڑی تھی۔ قد درمیانہ، جسم مائل بہ فربہی، رنگت صاف، چہرے پر کہیں کہیں جھائیوں کے مخصوص نشانات، جو خواتین میں عموماً خون کی کمی کے باعث نمودار ہو جاتے ہیں۔ شکل صورت کی اچھی اور نک سک سے درست۔ مجموعی طور پر وہ ایک سلجھی ہوئی اور سوبر خاتون نظر آتی تھی۔

"میرا نام سائرہ بانو ہے۔" وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی۔ "مجھے داؤد صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔"

"کون سے داؤد صاحب؟" میں نے استفسار کیا۔

"کون سے" کے الفاظ میں نے کچھ ایسے انداز میں ادا کئے تھے کہ میرے ریکارڈ میں ایک سے زیادہ داؤد نامی افراد ہوں اور مجھے یہ سمجھنے میں دقت محسوس ہو رہی ہو کہ وہ کون سے داؤد صاحب کا ذکر کر رہی ہے۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بالکل یاد نہیں آسکا تھا کہ یہ کس داؤد کا ذکرِ خیر ہو رہا تھا۔

سائرہ بانو نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"میں ان داؤد صاحب کا ذکر کر رہی ہوں، جو محمود آباد نمبر 1 میں رہتے ہیں اور محمود آباد نمبر 4 میں ان کا ایک چھوٹا سا کارخانہ ہے، جہاں پیکنگ کے لئے استعمال ہونے والے کارٹن تیار کئے جاتے ہیں۔ داؤد صاحب نے مجھے یقین دلایا ہے کہ اگر آپ نے میرا کیس پکڑ لیا تو میرا بیٹا باعزت بری ہو جائے گا۔"

وہ لمحے بھر کو سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوئی، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ "داؤد صاحب نے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔ چند سال پہلے آپ نے بڑی کامیابی سے ان کا ایک کیس لڑا تھا۔ ایک شخص نے ان کے فلیٹ پر قبضہ کر لیا تھا اور آپ کے توسط سے ان کا فلیٹ آزاد ہو سکا تھا۔ یہ واقعہ تو آپ کو اچھی طرح یاد ہوگا!"

باوجود کوشش کے بھی مجھے کچھ یاد نہ آسکا۔ تاہم اس کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اچھا، اچھا........ آپ ان داؤد صاحب کی بات کر رہی ہیں۔" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "سائرہ بانو! بتائیں، آپ کے بیٹے کو کیا ہوا ہے؟"

"میرے بیٹے گوشی کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔" اس نے بتایا۔

میں نے رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا، پھر پوچھا۔ "گوشی کی گرفتاری کا کیا سبب بتایا گیا ہے؟"

"گوشی کا اصل نام نصیر ہے جی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "پولیس نے گوشی کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔"

"گوشی پر کس کو قتل کرنے کا الزام ہے؟"

"مقتول کا نام ستار احمد ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "ستار، محمود آباد گیٹ پر رہتا تھا۔"

"کیا مقتول اور آپ کے بیٹے کے درمیان کوئی دشمنی وغیرہ تھی؟"

"کوئی ایسی دشمنی تو نہیں تھی، وکیل صاحب! کہ گوشی اس کے خون سے ہاتھ رنگ بیٹھتا۔" سائرہ بانو نے بتایا۔ "البتہ کچھ عرصہ پہلے دونوں میں لڑائی جھگڑا ہوا تھا۔"

دراصل یہ جھگڑا گوشی کے بڑے بھائی آفتاب اور ستار کے دوستوں کے مابین ہوا تھا، لیکن وجۂ تنازع بہرحال گوشی ہی رہا تھا، لیکن........"

اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک گہری سانس لی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"وکیل صاحب! میں نے اپنے دونوں بیٹوں کی پرورش بڑے خیال اور بڑی احتیاط سے کی ہے۔ مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے۔ چھوٹی موٹی گڑبڑ کے لئے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی، لیکن اس بات کا مجھے پکا یقین ہے کہ گوشی قاتل نہیں ہوسکتا۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت گوشی کو اس معاملے میں ملوث کیا گیا ہے اور میں چاہتی ہوں، آپ میرے بیٹے کو بے قصور ثابت کر کے اس جھمیلے سے نکال لیں۔ اسی مقصد کے لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔"

میں نے اس کی بات پوری توجہ سے سنی اور سوچ میں پڑ گیا۔ عموماً والدین کی نظر میں، خصوصاً ماں کی نگاہ میں اس کی اولاد بڑی اچھی ہوتی ہے۔ وہ کسی بھی نوعیت کی مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہوسکتی اور یہی اولاد کبھی پولیس کی گرفت میں آ جاتی ہے تو والدین کے نزدیک انہیں کسی گہری سازش کے تحت جھوٹے مقدمے میں اُلجھایا یا پھنسایا گیا ہوتا ہے۔ یہ میں نے والدین کے ایک عمومی رویّے کا ذکر کیا ہے۔ اسے فارمولا بنا کر صد فیصد والدین پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ بعض والدین ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں، جو اپنی اولاد کی اچھائیوں اور برائیوں سے بہ خوبی آگاہ ہوتے ہیں، اولاد کے عیب و ہنر ان کی نگاہ میں ایسے ہی عیاں ہوتے ہیں، جیسے دونوں ہاتھوں کی دسیوں انگلیاں۔

بعد ازاں، سائرہ بانو بھی ایک ایسی ہی ماں ثابت ہوئی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ کے بیٹے گوشی کو پولیس نے کب اور کہاں سے گرفتار کیا ہے؟"

"گوشی کی گرفتاری یکم اور دو مئی کی درمیانی رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے عمل میں آئی تھی۔" سائرہ بانو نے جواب دیا۔ "پولیس نے آدھی رات کو اسے گھر سے گرفتار کیا تھا۔"

"یکم مئی........" میں نے زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے ٹیبل کیلنڈر پر نگاہ ڈالی۔ اس روز مئی کی بارہ تاریخ تھی۔ میں نے قدرے تشویش ناک انداز میں کہا۔ "یعنی گوشی کی گرفتاری کو کم از کم دس دن گزر چکے ہیں۔ اس کا مطلب ہے........"

میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور بدستور گہری سنجیدگی سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، پولیس نے اگلے روز، یعنی گرفتاری کی اگلی صبح گوشی کو عدالت میں پیش کر کے اس کا جسمانی ریمانڈ لے لیا ہوگا اور عین ممکن ہے، ریمانڈ کی مقررہ مدت قریب الختم ہو؟"

"قریب الختم نہیں، وکیل صاحب!" سائرہ بانو نے تصحیح کرتے ہوئے بتایا۔ "ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے گوشی کو ایک بھاری چالان کے ساتھ عدالت میں پیش کیا تھا اور اب........" وہ سانس ہموار کرنے کے لئے تھمی، پھر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اور اب وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں ہے۔"

"اوہ........!" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ "کیا آپ نے ابھی تک اپنے بیٹے کے لئے کسی وکیل کا بندوبست نہیں کیا؟ آپ تو خاصی سمجھ دار اور بردبار خاتون نظر آتی ہیں، پھر اتنی بڑی غلطی کیوں؟"

"میں نے گوشی کی بریّت کے لئے اس کا کیس ایک وکیل کے سپرد کیا تھا۔" وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

"پھر........" میں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا اور پوچھا۔ "اس وکیل نے گوشی کی ضمانت کروانے کی کوشش نہیں کی؟"

"وکیل صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ عدالتی بکھیڑوں سے پہلی مرتبہ میرا واسطہ پڑا ہے۔ لہٰذا ناتجربہ کاری کے باعث وکیل کے انتخاب میں مجھ سے غلطی ہوگئی۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔ "پہلی ہی پیشی پر مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ وکیل بڑا پھسپھسا اور کام چلاؤ قسم کا تھا۔ کسی قتل کے ملزم کا مقدمہ لڑنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے پہلی فرصت میں اسے فارغ کر دیا۔"

اس نے سلسلۂ بیان کو تھوڑی دیر کے لئے روکا، ایک بوجھل سانس خارج کی اور اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''میری خوش قسمتی کہ اس کے بعد داؤد صاحب سے میری ملاقات ہوگئی اور انہوں نے مجھے آپ سے ملنے کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ آپ دوسروں کی بہ نسبت خاصے مہنگے وکیل ہیں۔ فیس اپنی مرضی کی لیتے ہیں اور کام ایسا پائیدار کرتے ہیں کہ کیس کے آخر میں دل اور دامن خوشیوں سے بھر جاتا ہے۔ آپ کی یہی تعریف مجھے یہاں لے آئی ہے۔''

وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوئی، اُمید بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

''پیسے کم زیادہ خرچ ہونے کی بات نہیں۔ اولاد سے زیادہ قیمتی شے اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ میں کوئی مالدار عورت تو نہیں ہوں، لیکن آپ اپنی فیس کے حوالے سے فکرمند نہ ہوئیے گا۔ میں آپ سے کوئی رعایت نہیں کراؤں گی۔ آپ بس، جی جان سے گوشی کی رہائی کے لئے تیار ہوجائیں۔''

میں نے کہا۔

''میں تو جو بھی کیس لیتا ہوں، اس پر جی جان ہی سے محنت کرتا ہوں۔ اور جہاں تک آپ کے بیٹے گوشی کے کیس کی بات ہے تو پہلے آپ مجھے اس کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہ کریں۔ جب تک میری تسلی نہیں ہو جاتی، میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''آپ کس قسم کی تسلی چاہتے ہیں، وکیل صاحب؟'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں نے ابتدائی معلومات تو آپ کو فراہم کر دی ہیں۔ اور کچھ پوچھنا چاہیں تو پوچھیں۔''

میں نے پوچھا۔

''آپ نے تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ آپ کے بیٹے اور مقتول کے درمیان دشمنی وغیرہ نہیں پائی جاتی تھی، لیکن کچھ عرصہ پہلے ان میں کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ بعض اوقات ماضی کا کوئی چھوٹا سا واقعہ، حال میں بہت بڑا طوفان بن کر سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے آپ مجھے ان کے درمیان ہونے والے جھگڑے کے بارے میں کھل کر بتائیں؟''

آئندہ آدھے گھنٹے میں، سائرہ بانو نے مجھے تمام تر تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ یہ کہانی اس کی زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے متذکرہ جھگڑے اور زیرِ سماعت کیس پر تیز روشنی ڈالتی تھی۔ میں نے ہمہ تن گوش ہو کر گوشی کے کارناموں کی داستان سنی اور اہم پوائنٹس اپنے پیڈ پر نوٹ کرتا چلا گیا۔ وہ واقعات مکمل کر کے خاموش ہوئی تو میں اس کے بیٹے کا کیس لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

وہ اپنے دل و دماغ کا بوجھ ہلکا کر کے پُرسکون ہوگئی تو میں نے اس سے اپنی فیس وصول کر کے رسید بنا دی۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا تو میں نے پوچھا۔

''اگلی پیشی کی تاریخ کب ہے؟''

''دس دن بعد۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس دوران میں جیل جا کر گوشی سے ملاقات کرلوں گا۔ اس کا ایک اسپیشل انٹرویو بہت ضروری ہے۔ اسی دوران میں وکالت نامے کے علاوہ دیگر ضروری کاغذات پر اس کے دستخط بھی لے لوں گا۔ اس طرح آئندہ پیشی سے پیش تر میں اتنی تیاری کرلوں گا کہ کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔'' میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ مطمئن ہو کر گھر چلی جائیں۔ اِن شاء اللہ اگلی پیشی پر عدالت میں ملاقات ہوگی۔''

اس نے ایک مرتبہ پھر میرا شکریہ ادا کیا اور دعائیں دیتے ہوئے میرے دفتر سے رخصت ہوگئی۔ وہ خاصی افسردہ آئی تھی، لیکن جاتے وقت اس کی آنکھوں میں اُمید کی کرن جاگ چکی تھی۔

سائرہ بانو کی زندگی کی کہانی جہدِ مسلسل کی انمول داستان تھی۔ اس نے بڑے آزمائشی اوقات میں، ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں بیٹوں کو پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ نہ صرف بڑا کیا تھا، بلکہ مناسب تعلیم بھی دلوائی تھی۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ تمام تر حالات آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، تاکہ آپ بھی سائرہ بانو کے عزم اور استقلال سے آگاہ ہو جائیں۔ ہمت والوں کی کہانیاں بڑی ولولہ انگیز ہوتی ہیں۔ یہ بار بار دہرائی جانا چاہئیں، تاکہ کم ہمت والوں اور مُردہ دلوں میں جان پڑ

جائے۔

صفحات کا خیال رکھتے ہوئے، میں نے ان سنسنی خیز واقعات کو قدرے مختصر کر دیا ہے لیکن اس بات کو بھی خاص طور پر ملحوظِ خیال رکھا ہے کہ قارئین کو مطالعے کے دوران کہیں تشنگی کا احساس نہ ہو۔



آفتاب دس سال کا اور نصیر عرف گوشی پانچ سال کا تھا، جب ان کے والد جہانگیر کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ وہ ایک اچھی کمپنی میں ملازم تھا، لہٰذا اس کی موت پر سائرہ بانو کو ایک معقول رقم مل گئی۔ اچھے وقتوں میں جہانگیر نے اپنا گھر لے لیا تھا، اس لئے سائرہ بانو اور دونوں بچوں کے لئے رہائش وغیرہ کا مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ سائرہ نے کمپنی سے ملنے والی رقم کو محفوظ کر لیا اور بچوں کی پرورش کے لئے رزق روزگار کی خاطر گھر سے نکل پڑی۔

یہ اس کا ایک دانش مندانہ فیصلہ تھا۔ ورنہ اگر انسان ہاتھ پاؤں چھوڑ کر گھر بیٹھ جائے تو ایک نہ ایک دن قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ سائرہ نے ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ اس زمانے میں تعلیم کی ایسی بے توقیری نہیں تھی، جو آج کل دیکھنے میں آتی ہے، لہٰذا سائرہ کو بڑی آسانی سے ایک اچھے آفس میں جاب مل گئی۔

بچے بڑی تیزی سے بڑے ہوتے گئے۔ ان کی پرورش کے ساتھ ساتھ سائرہ نے تعلیم و تربیت پر بھی خاص دھیان دیا تھا۔ دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آفتاب ایک سنجیدہ مزاج، صلح جو اور پڑھاکو لڑکا تھا۔ اسے فضول سرگرمیوں، حتیٰ کہ کھیل کود سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن رہتا یا پھر کتابوں کے ساتھ مشغول۔

آفتاب کے برعکس نصیر کو پڑھنے لکھنے سے زیادہ رغبت نہیں تھی۔ وہ پڑھائی کو بڑا سرسری لیتا تھا۔ جبکہ اس کی دلچسپی کے کاموں میں کھیل کود اور دوستوں کے ساتھ گھنٹوں گھر سے باہر رہنا سرِفہرست تھے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ وہ کسی طرح دھکا اسٹارٹ

چل کر میٹرک تک تو پہنچ گیا، لیکن وہاں پہنچ کر وہ اس بری طرح سے ناکام ہوا کہ پڑھائی ہی چھوڑ بیٹھا۔ اب اس کا کام محض سونا اور آوارہ گردی کرنا تھا۔

آفتاب نے باقاعدہ کالج سے گریجویشن کیا اور ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم ہو گیا۔ جس روز اس نے ملازمت جوائن کی، سائرہ بانو کو نوکری سے ہٹا دیا۔ اس نے اپنی ماں کو پچھلے کئی سال سے کڑی محنت کرتے دیکھا تھا۔ وہ یہ ساری جدوجہد انہی دونوں بھائیوں کے لئے کر رہی تھی۔ آفتاب کی خواہش تھی کہ گھر کی معاشی ذمے داریاں وہ سنبھالے گا۔ ماں نے بہت کام کر لیا، اب اسے آرام کرنا چاہئے۔

سائرہ بانو نے بیٹے کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے جاب چھوڑ دی تھی۔

دو سال بعد جب آفتاب اچھا کمانے لگا اور اس کی جاب بھی سیٹ ہو گئی تو سائرہ نے اس کی شادی کروا دی۔ سائرہ کی خوش قسمتی کہ اسے بہو بھی اپنے ہی مزاج کی ملی۔ سلمیٰ بہت ہی سگھڑ اور سلیقہ شعار لڑکی تھی۔ وہ ہر طرح سے آفتاب کا خیال رکھتی، نصیر کو اپنا چھوٹا بھائی اور سائرہ بانو کو امی سمجھتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سلمیٰ رشتوں کی محبت کو ترسی ہوئی تھی۔ بچپن میں اس کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ بھائی بہن کوئی تھا نہیں۔ ایک بے اولاد جوڑے نے اس کو پال پوس کر جوان کیا تھا، جو دور کے رشتے میں اس کے ماموں اور ممانی لگتے تھے۔ سلمیٰ کی آفتاب سے شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد اس بے اولاد جوڑے کا بھی یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا تھا۔ اس نوعیت کے پس منظر کے ساتھ سلمیٰ کو اپنی سسرال میں ایڈجسٹ ہونے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی تھی۔

سلمیٰ اور آفتاب کی شادی کو لگ بھگ تین سال ہونے کو آ رہے تھے، لیکن ابھی تک سلمیٰ کی گود ہری نہیں ہو سکی تھی۔ سائرہ بانو کی دعاؤں کے علاوہ لیڈی ڈاکٹر کا بھی علاج معالجہ جاری تھا اور اس دن کا انتظار تھا کہ جب قدرت ان پر نسلی بقا کے لئے مہربان ہو جاتی!

اب میں اس واقعے کی طرف آتا ہوں، جب ملزم نصیر عرف گوشی اور مقتول ستار کے بیچ کوئی جھگڑا ہوا تھا، جس کی پاداش بے چارے شریف النفس آفتاب کو بھگتنا پڑی تھی۔ اس دنیا میں عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ کرے کوئی، بھرے کوئی........ مگر

یہ صورتِ حال عارضی ہوتی ہے۔

قدرت کی لاٹھی بے آواز تو ہے مگر اندھی اور نا انصاف نہیں۔ وہ موقع دیتی ہے، ڈھیل فراہم کرتی ہے پھر ظالم اور مظلوم کے درمیان دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیتی ہے۔ اس بے آواز لاٹھی کی غیر محسوس حرکت ظالم کو سزا اور مظلوم کو عطا سے مالا مال کر دیتی ہے، اس لئے امید کے دامن کو کبھی بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔

وہ شام کا وقت تھا اور رات کے آغاز میں چند ہی منٹ باقی تھے۔ آفتاب اس وقت تک گھر آ جاتا تھا۔ اس کا آفس صبح دس سے شام چھ بجے تک کا تھا۔ وہ نو بجے گھر سے روانہ ہو جاتا اور کم و بیش شام سات بجے واپس لوٹتا تھا۔ اس کا دفتر آئی آئی چندریگر روڈ پر واقع تھا۔ دفتر آنے جانے کے لئے وہ اپنی موٹر سائیکل استعمال کیا کرتا تھا۔ سلمٰی اور سائرہ بانو بڑی بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ گوشی حسبِ معمول گھر سے غائب تھا۔

گھنٹی کی آواز نے سائرہ بانو کو چونکا دیا۔ اس نے سلمٰی سے کہا۔ ”بیٹی! دروازہ کھولنا۔ لگتا ہے، آفتاب واپس آ گیا۔“

عام طور پر سائرہ بانو اپنے بیٹے کے لئے خود ہی دروازہ کھولا کرتی تھی، لیکن اس روز دوپہر کے بعد سے اسے بخار آ گیا تھا۔ جبھی اس نے بہو سے دروازہ کھولنے کو کہا تھا۔ سائرہ اپنے بیڈ پر لیٹی آرام کر رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد سلمٰی اپنی ساس کے پاس پہنچی۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ سائرہ نے فوراً اس کی کیفیت کو بھانپ لیا اور تشویش ناک لہجے میں دریافت کیا۔

”کیا ہوا بیٹی! تم اتنی بوکھلائی ہوئی کیوں ہو؟...... آفتاب تو خیریت سے واپس آ گیا ہے نا؟“

”خیریت نہیں ہے امی!“ سلمٰی روہانسی ہو گئی۔

سائرہ بانو ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور پوچھا۔ ”کچھ بتاؤ تو سہی، آخر ہوا کیا ہے؟“

”امی! آفتاب کا جھگڑا ہو گیا ہے۔“ سلمٰی نے بھرّائی ہوئی آواز میں بتایا۔

”آفتاب کا جھگڑا......؟“ سائرہ بانو نے بے یقینی سے دہرایا۔

یہی اطلاع اگر گوشی کے حوالے سے آئی ہوتی تو سائرہ کو یقین کرنے میں کوئی تردّد محسوس نہ ہوتا۔ لیکن آفتاب...... وہ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکی، سلمٰی بتا رہی تھی۔

”محلے کا ایک لڑکا آیا تھا یہ بتانے۔ ادھر ہی مارکیٹ کے قریب جو چھوٹا سا پارک ہے نا، جس کے اندر ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے، اسی پارک کے گیٹ کے سامنے، دو تین اوباش لڑکوں نے آفتاب کو بری طرح پیٹا ہے۔ وہ اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ زمین پر گرے پڑے ہیں اور......“ بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

سائرہ بانو اپنی بیماری کی پروا کئے بغیر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اضطراری لہجے میں بولی۔

”میں دیکھتی ہوں جا کر...... آخر یہ ہوا کیسے؟“

سلمٰی نے کوشش کی کہ اس کی ساس گھر میں رک جائے اور وہ اپنے شوہر کو دیکھنے کے لئے جائے وقوعہ کا رخ کرے۔ لیکن سائرہ بانو نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے گھر میں رہنے کی تاکید کر کے وہ خود ہی مارکیٹ کی جانب روانہ ہو گئی۔

محمود آباد نمبر 1 سے ہی مارکیٹ کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ مین بازار کی طرف آنے کے بجائے اس نے گرین بیلٹ کا رخ کیا اور دو چار گلیوں میں سے ہوتے ہوئے وہ جائے فساد پر پہنچ گئی۔

وہاں پر لوگوں کا ایک مجمع سا لگا ہوا تھا۔ آفتاب اور اس کی موٹر سائیکل کو اٹھا لیا گیا تھا۔ موٹر سائیکل تو اپنے قدموں پر کھڑی ہو گئی تھی، لیکن آفتاب کی ٹانگوں پر ایسی خطرناک چوٹیں آئی تھیں کہ وہ کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ایک قریبی ہوٹل والے نے بیٹھنے کے لئے اسے ایک کرسی دے دی تھی۔ بیٹے کی حالت دیکھ کر سائرہ بانو کا دل بھر آیا۔ وہ وہاں پر موجود لوگوں سے اس واقعے کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگی۔

اسے بتایا گیا کہ آفتاب موٹر سائیکل پر سوار یہاں سے گزر رہا تھا کہ تین لڑکوں نے اسے زبردستی روک لیا اور پھر گھیر کر مارنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں کرکٹ بیٹ اور وکٹس وغیرہ تھیں۔ جب تک بیچ بچاؤ کرانے والے وہاں پہنچتے، تینوں حملہ آور اپنا ”کام“ کر کے وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لوگوں نے اپنی مدد

آپ کے تحت، آفتاب کو ہسپتال پہنچوانے کے لئے گاڑی کا انتظام بھی کر لیا تھا اور ایک معمر شخص نے سائرہ کو یہ بھی بتایا کہ اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دے دی گئی ہے اور اب پولیس وہاں پہنچنے ہی والی ہے۔

"وہ ظالم کون تھے؟" سائرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

معمر شخص جس کا نام جواد حسین تھا، اس نے بتایا۔

"ان تینوں لڑکوں کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ شاید وہ کسی دوسرے علاقے سے تعلق رکھتے تھے، البتہ........"

جواد حسین کا مذکورہ پارک کے سامنے جنرل اسٹور تھا اور وہ اپنے علاقے کے تقریباً سبھی لوگوں کو جانتا تھا۔ اس نے "البتہ" پر جملہ نامکمل چھوڑا تو سائرہ نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

"آپ بولتے بولتے خاموش کیوں ہو گئے، بھائی صاحب؟"

وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس واقعے سے کوئی گھنٹہ بھر پہلے یہیں کے ایک لڑکے نے مجھ سے ٹینس بال خریدی تھی اور وہ تینوں حملہ آور میرے اسٹور سے باہر کھڑے تھے۔ بعد میں بال خریدنے والا لڑکا بھی انہی میں شامل ہو کر پارک کی طرف چلا گیا تھا۔ مجھے یقین ہے، وہ تینوں اسی لڑکے کے ساتھی تھے۔"

"لیکن وہ لڑکا کون تھا، جسے آپ یہیں کا بتا رہے ہیں؟" سائرہ نے پوچھا۔

"مجھے اس کا نام تو معلوم نہیں۔" وہ اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے بولا۔ "ہاں، یہ جانتا ہوں کہ اس لڑکے کا باپ ادھر گیٹ پر تکا بوٹی اور کباب وغیرہ بیچتا ہے۔"

"اوہ........ آپ صغیر چاچا کی بات تو نہیں کر رہے؟" سائرہ نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں........ ہاں........" جواد حسین نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

"میں صغیر احمد کباب فروش ہی کا ذکر کر رہا ہوں۔"

تھانہ چونکہ جائے وقوعہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا، اس لئے ایک اے ایس آئی اور ایک کانسٹیبل موٹر سائیکل پر سوار ہو کر جائے فساد پر پہنچ گئے۔ اے ایس آئی نے

آفتاب سے چند ایک سوالات کیئے، خصوصاً حملہ آوروں کے بارے میں استفسار کیا۔ آفتاب انہیں بالکل نہیں جانتا تھا، لہٰذا وہ پولیس والوں کو کوئی مفید معلومات فراہم نہ کر سکا۔ آفتاب کی حالت کے پیش نظر اے ایس آئی نے فوری طور پر اسے ہسپتال پہنچانے کی اجازت دے دی اور موقع پر موجود لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔

جواد حسین کی زبانی اے ایس آئی کو اتنا مواد مل گیا کہ وہ تفتیشی کارروائی کو با آسانی آگے بڑھا سکتا تھا۔ صغیر کباب فروش کے بیٹے کی صورت میں ایک مضبوط سراغ موجود تھا، جو اپنے تین ساتھیوں کے بارے میں تفصیلاً بتا سکتا تھا۔

اے ایس آئی نے سائرہ بانو سے کہا۔

"خاتون! آپ گھر جائیں۔ آپ کے بیٹے کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں اس سے لمبے چوڑے سوالات کرتا۔ وہ ہسپتال سے فارغ ہو کر جب واپس آ جائے گا تو میں اس کا تفصیلی بیان لینے آپ کے گھر پر آؤں گا۔ اس کے بعد ہی کوئی باقاعدہ کارروائی ہو گی۔"

"اور یہ جو صغیر چاچا کے بیٹے کا پتہ چلا ہے؟" سائرہ نے روہانسی آواز میں کہا۔

"اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کریں گے آپ؟ یہ تو معلوم ہونا چاہئے نا، یہ تینوں کون تھے جنہوں نے میرے بیٹے کو ہسپتال جانے پر مجبور کر دیا ہے۔ آخر آفتاب سے ان کی دشمنی کیا تھی؟"

"کیوں پوچھ گچھ نہیں کریں گے، آنٹی!" اے ایس آئی مضبوط لہجے میں بولا۔

"میں سیدھا صغیر احمد کباب فروش کے پاس ہی جا رہا ہوں۔ یہ تو مجھے پتہ ہے کہ وہ ادھر گیٹ پر ہی رہتا ہے۔ اس کے بیٹے سے مل کر میں ساری معلومات کرتا ہوں۔ وہی بتا سکے گا کہ اس کے وہ تینوں ساتھی کون تھے، جنہوں نے آپ کے بیٹے کے ساتھ مار پیٹ کی ہے۔ آپ فکر نہ کریں، اگر آپ کا بیٹا بے قصور ثابت ہوا تو میں حملہ آوروں کو بڑا یادگار سبق سکھاؤں گا۔"

"میرے آفتاب نے تو آج تک کسی کو اُف تک نہیں کہی۔" سائرہ بانو نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد تو بہت دور کی بات ہے۔"

"میں نے کہا ہے نا، آپ مطمئن ہو کر اپنے گھر چلی جائیں۔" اے ایس آئی سرفراز شاہ نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ کے بیٹے کے ساتھ میں ناانصافی نہیں

ہونے دوں گا۔''

اے ایس آئی کی تشفی کے بعد سائرہ بانو بظاہر مطمئن ہو گئی، لیکن اس کے دل میں بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ گھر پہنچی، سلمٰی کو مختصر الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کہا۔

''سلمٰی! تم گھر ہی میں رہنا۔ میں ہسپتال جا رہی ہوں، آفتاب کو دیکھنے۔ یہ گوشی پتہ نہیں ہر وقت کہاں مرا رہتا ہے۔ اگر اس وقت وہ یہاں موجود ہوتا تو بہت کام آتا۔''

سلمٰی نے کہا۔

''گوشی کو تو شاید اس واقعے کا علم ہی نہ ہو اور........ امی! سن لیں، میں آپ کو اکیلے ہسپتال نہیں جانے دوں گی۔ آپ کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں۔''

''میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا، سلمٰی!'' سائرہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''معمولی سا بخار ہی تو ہے۔ ابھی واپس آ جاؤں گی۔ بس رکشہ میں آنا جانا کرنا ہے۔''

''کچھ بھی ہے، امی! میں بھی آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔'' سلمٰی نے ضدی لہجے میں کہا۔ ''رکشہ میں آنا جانا ہے، کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔''

بہو کی ضد کے سامنے سائرہ مجبور ہو گئی۔ گلی کے دو لڑکے بھی ایک موٹر سائیکل پر سوار ہو کر اس کے ساتھ ہسپتال کی جانب روانہ ہو گئے۔ یہ دونوں لڑکے امتیاز اور کاشف، آفتاب کے اچھے دوست تھے۔ آفتاب کی موٹر سائیکل کو ایک لڑکے نے سائرہ بانو کے ساتھ ہی گھر پہنچا دیا تھا۔ گھر سے نکلنے سے قبل سائرہ نے بیرونی دروازے کو لاک کر دیا تھا۔

قصہ مختصر، آفتاب رات گیارہ بجے اپنے گھر پر موجود تھا........ اور اس طرح موجود تھا کہ اس کی بائیں ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ پنڈلی کے مقام سے ہڈی میں فریکچر آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا دایاں کندھا بھی بری طرح زخمی تھا، جہاں مناسب مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ چہرے پر بھی ایک دو زخموں کے نشان نظر آ رہے تھے۔

سائرہ اور سلمٰی اپنے اپنے انداز میں آفتاب سے اس حادثے کا سبب پوچھ رہی تھیں۔ وہ بے چارہ کچھ جانتا ہوتا تو بتاتا بھی۔ نقاہت بھرے لہجے میں اس نے کہا۔

''امی! مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوا کیا تھا۔ وہ تینوں میرے لئے بالکل اجنبی

تھے۔ وہ پارک کے گیٹ کے پاس کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے رکنے کو کہا۔ میں سمجھا کہ وہ کوئی راستہ وغیرہ پوچھنا چاہتا ہے۔ میں نے اپنی موٹر سائیکل روک دی اور اسی وقت ان تینوں نے مجھ پر بیٹ اور وکٹس کی بارش کر دی۔ میں نے خود کو بچانے اور سنبھالنے کی بہت کوشش کی، لیکن پلک جھپکتے میں انہوں نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔''

سائرہ بانو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آفتاب! تم صغیر چاچا کو جانتے ہو نا، ادھر گیٹ پر جن کی تکا بوٹی اور کباب وغیرہ کی دکان ہے؟''

''گیٹ'' دراصل محمود آباد کے ایک علاقے کا نام ہے، جو خاصی معروف جگہ ہے۔ اس کے بعد پھر محمود آباد نمبر 1 شروع ہو جاتا ہے، جس کی ایک گلی میں سائرہ بانو کی رہائش تھی۔ گیٹ کے حوالے سے معلومات صرف ان لوگوں کو فراہم کی گئی ہیں، جو کراچی سے باہر کسی دوسری جگہ رہتے ہیں، تاکہ یہ لفظ ان کے لئے کسی اُلجھن کا باعث نہ بنے۔

آفتاب نے جواب دیا۔

''ہاں، میں صغیر چاچا کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں ان سے کئی مرتبہ تکے کباب لے کر آیا ہوں۔ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟ صغیر چاچا کو کیا ہوا ہے؟''

''آفتاب بیٹا!'' سائرہ نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''اُدھر پارک کے سامنے ایک بڑا سا جنرل اسٹور ہے۔ اس جنرل اسٹور کے مالک جواد حسین نے مجھے بتایا ہے کہ اس واقعے سے کچھ دیر پہلے صغیر چاچا کا لڑکا اس کے اسٹور سے ٹینس کی بال خریدنے آیا تھا اور وہ تینوں لڑکے بھی اس کے ساتھ تھے، جنہوں نے تم پر حملہ کر کے یہ حالت بنائی ہے۔ میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ کہیں صغیر احمد کے بیٹے سے تو تمہارا کوئی جھگڑا نہیں ہے؟''

''صغیر چاچا کا تو صرف ایک ہی بیٹا ہے........ ستار۔'' آفتاب نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کی تو مجھ سے کوئی دشمنی نہیں۔ ہاں........''

وہ ''ہاں'' کے بعد چونکنے والے انداز میں متوقف ہوا تو سائرہ نے جلدی سے

پوچھا۔ ”تم بولتے بولتے اچانک رک کیوں گئے ہو؟“

”گوشی کہاں ہے، امی؟“ آفتاب نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کر دیا۔

”گوشی......گوشی کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے، آفتاب؟“

”آپ پہلے بتائیں امی! وہ گھر آ گیا ہے کیا؟“

”نہیں۔“ سائرہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”اس وقت تک آ جایا کرتا ہے۔ پتہ نہیں، آج کہاں رہ گیا......مگر تم صغیر احمد کے ذکر کو فراموش کر کے گوشی کے پیچھے کیوں پڑ گئے؟“

آفتاب کے مبہم رویّے نے سائرہ بانو اور سلمٰی کو ذہنی طور پر بری طرح اُلجھا دیا تھا۔ سلمٰی نے پوچھا۔

”آپ بتاتے کیوں نہیں ہیں؟......کیا صغیر چاچا کے بیٹے کا اپنے گوشی سے کوئی تعلق ہے؟“

”بڑا گہرا اور خطرناک تعلق ہے۔“ آفتاب نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”آفتاب! تم تو مجھے ڈرائے جا رہے ہو۔“ سائرہ بانو نے اضطراری لہجے میں کہا۔

”اب بتا بھی دو کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟“

اس سے پہلے کہ آفتاب اپنی والدہ کے استفسار کا جواب دیتا، بیرونی دروازے کی گھنٹی بج اُٹھی۔ سائرہ نے بے ساختہ کہا۔

”لگتا ہے، گوشی آ گیا ہے۔“

”میں دیکھتی ہوں امی!“ یہ کہتے ہوئے سلمٰی اُٹھ کر بیرونی دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ واپس آ گئی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”باہر پولیس آئی ہے۔“

”اوہ......!“ سائرہ بانو نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ”اے ایس آئی سرفراز شاہ آیا ہوگا۔ آفتاب کا بیان قلم بند کرنے۔ ٹھہرو، میں اسے لے کر آتی ہوں۔ سلمٰی! تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔“

جائے وقوعہ سے رخصت ہوتے وقت اے ایس آئی نے اپنے نام کے ساتھ مکمل تعارف کرا دیا تھا اور سائرہ بانو کو بتایا تھا کہ وہ رات کو کسی وقت اس کے گھر آئے گا۔

سائرہ بانو، سرفراز شاہ کو اپنے ساتھ لے کر اسی کمرے میں آ گئی، جہاں زخموں سے چُور آفتاب ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ بیڈ کے قریب ہی ایک کرسی رکھ دی گئی۔ اے ایس آئی مذکورہ کرسی پر بیٹھ کر آفتاب سے حال احوال لینے لگا تو سائرہ بانو، بہو کے پاس آ گئی۔ سلمٰی سے اس نے چائے بنانے کو کہا اور دوبارہ اسی کمرے میں پہنچ گئی، جہاں سے گئی تھی۔

اے ایس آئی نے گھما پھرا کر آفتاب سے درجن بھر سوالات کیے۔ اس کے جوابات کے اہم نکات کو وہ ایک ڈائری میں درج کرتا چلا گیا۔ جب آفتاب کے بیان سے اس کی تسلی ہو گئی تو اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور روئے سخن سائرہ بانو کی جانب موڑتے ہوئے پوچھا۔

”آنٹی! آفتاب سے ایک چھوٹا بیٹا بھی ہے نا، آپ کا؟“

”جی ہاں۔“ سائرہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اس کا نام نصیر ہے۔“

”نصیر یا گوشی؟“

اے ایس آئی کے استفسار نے سائرہ بانو کو چونکا دیا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اس کا درست نام تو نصیر ہی ہے جی، مگر بچپن میں وہ بڑا گول مٹول ہوا کرتا تھا۔ اس لئے اس کا نام گوشی پڑ گیا، جو اب تک چلا آ رہا ہے......لیکن آپ گوشی کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟ سب خیریت تو ہے نا؟“

اے ایس آئی کی آمد سے قبل آفتاب نے بھی گوشی ہی کا تذکرہ چھیڑا ہوا تھا، لیکن اس کی بات بیچ ہی میں رہ گئی تھی اور اب یہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر بھی گوشی ہی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اس واقعاتی مماثلت اور قدرِ مشترک نے سائرہ کے ذہن میں اَن گنت اُلجھنیں بھر دیں۔ وہ سوالیہ نظروں سے سرفراز شاہ کو دیکھنے لگی۔

اے ایس آئی نے جواباً ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ابھی تک تو خیریت ہی ہے، آنٹی! مگر آگے کے بارے میں پیشگی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ یہ بتائیں، نصیر عرف گوشی گھر میں موجود ہے؟ میں اس سے دو باتیں کرنا

چاہتا ہوں۔"

"آپ کو تو پتہ ہی ہے، جوان لڑکے آج کل آدھی آدھی رات تک گھر سے باہر رہتے ہیں۔" سائرہ بانو نے معتدل لہجے میں کہا۔ "گوشی عموماً اس وقت تک آ جایا کرتا ہے، مگر آج کچھ زیادہ ہی لیٹ ہو گیا۔"

"کیا گوشی جانتا ہے کہ اس کے بڑے بھائی کو کون سا حادثہ پیش آ گیا ہے؟"

"نہیں۔" سائرہ بانو نے نفی میں گردن ہلائی۔ "وہ سہ پہر کے وقت گھر سے نکلا تھا اور ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی۔ جب کہ آفتاب سے مار پیٹ والا واقعہ مغرب سے تھوڑی دیر پہلے پیش آیا تھا۔"

"آنٹی!" اے ایس آئی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کے بڑے بیٹے کے ساتھ جو کچھ بھی پیش آیا ہے، اس کا سبب نصیر عرف گوشی ہی ہے۔"

"وہ......وہ کیسے؟" سائرہ بانو نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"وہ اس طرح کہ......" اے ایس آئی ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "وہ تینوں لڑکے دراصل گوشی کی دھنائی کرنے آئے تھے، لیکن خلافِ معمول گوشی آج کرکٹ کھیلنے اس پارک میں نہیں پہنچا۔ جب ان کا انتظار طول پکڑ گیا اور واپسی کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ آفتاب پر ان کی نگاہ پڑ گئی۔ وہ جھنجلاہٹ اور غصے میں تو تھے ہی، جب گوشی ہاتھ نہیں آیا تو انہوں نے سارا غصہ آفتاب پر نکال ڈالا۔"

"لیکن وہ لوگ گوشی کو مارنے کیوں آئے تھے؟" اے ایس آئی کے خاموش ہونے پر سائرہ نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

اے ایس آئی نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔

"جنرل اسٹور والے شخص جواد حسین نے صغیر احمد کے بیٹے کی نشاندہی کی تھی۔ اس لڑکے کا نام ستار ہے۔ ہم اسے پکڑ کر تھانے لے گئے تھے۔ اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے ایک عجیب کہانی سنائی ہے۔ ستار کا گوشی سے کوئی تنازع ہے۔ وہ خود پسِ پردہ رہ کر اپنے دوست رفیق کے ذریعے گوشی کی ٹھکائی کرنا چاہتا تھا۔ رفیق اعظم بستی میں رہتا ہے۔ رفیق اس "معرکے" کے لئے اپنے دو اور دوستوں کو بھی لے آیا۔ یہ دوست فدا حسین اور نوازش علی ہیں جو ادھر کورنگی ڈھائی نمبر پر رہتے ہیں۔ گوشی کی خوش قسمتی کہ

وہ خلافِ معمول پارک میں کھیلنے نہیں آیا۔ اس کی گھات میں انتظار کرنے والوں کو "بوریت" ہوئی تو انہوں نے بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی...... کے مصداق آفتاب کو روک کر اس کی پٹائی کر دی۔ یہ ہے ساری کہانی۔"

"لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، شاہ صاحب!" سائرہ بانو نے اے ایس آئی کے خاموش ہونے پر متذبذب انداز میں کہا۔ "ستار اور گوشی کے درمیان ایسی کیا چپقلش تھی کہ ان ظالموں نے میرے سیدھے سادے بیٹے کو روئی کے مانند دھنک ڈالا؟"

"کیا آپ کو اس بارے میں کچھ پتہ نہیں آنٹی؟" سرفراز شاہ نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"نن......نہیں۔" سائرہ بانو کی "نہیں" میں بھی حد درجہ حیرت تھی۔

اے ایس آئی نے کہا۔ "کیا آفتاب نے بھی آپ کو کچھ نہیں بتایا؟"

سائرہ بانو نے بے اختیار آفتاب کی طرف دیکھا۔ آفتاب نے لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر لی تھیں اور چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ وہاں ہونے والی گفتگو کے مفہوم اور پس منظر سے اچھی طرح واقف ہے۔ سائرہ بانو دوبارہ اے ایس آئی کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

"آفتاب نے تو اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ آپ ہی وضاحت کر دیں کہ یہ کیا معاملہ ہے؟"

اے ایس آئی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔

"آنٹی! یہ قصہ کچھ اس طرح ہے کہ آپ کا بیٹا گوشی پچھلے کچھ عرصے سے ستار کی گلی کے بہت زیادہ چکر لگا رہا ہے اور اس کا سبب ستار کی بہن نزہت ہے، جو ستار سے دو سال بڑی ہے۔ ستار کو جب گوشی کی نازیبا حرکتوں کے بارے میں پتہ چلا تو اس نے ایک دو مرتبہ روک کر اسے وارننگ دی کہ اگر وہ باز نہیں آیا تو اسے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس وارننگ کے بعد بھی گوشی کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تو اتمام حجت کے طور پر ستار نے اپنے دوست رفیق کے توسط سے آفتاب کو اس صورتِ

گا۔ رفیق کا ایک بھائی شمشاد علی کسی تھانے میں سب انسپکٹر ہے۔ اس نے اپنے بھائی کا حوالہ دیتے ہوئے آفتاب سے کہا تھا کہ اگر گوشی پھر کبھی ستار کی گلی میں نظر آیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی اور ٹوٹی ہوئی ٹانگوں سمیت اسے حوالات میں بھی بند کر دیا جائے گا۔''

اے ایس آئی تھوڑی دیر کے لئے متوقف ہوا، پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''پتہ نہیں، آفتاب نے گوشی کو سمجھایا یا نہیں، لیکن دیکھنے میں یہ آیا کہ آپ کا چھوٹا بیٹا اپنی روش سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہٹا۔ اس صورتِ حال نے ستار کو پاگل کر دیا۔ اس نے رفیق سے بات کی۔ اس وقت رفیق کے پاس اس کے دو دوست بھی موجود تھے، فدا حسین اور نوازش علی۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، یہ دونوں کورنگی میں رہتے ہیں اور دنگے فساد میں خاصی مہارت بھی رکھتے ہیں۔ ستار، رفیق کا دوست ہے، چنانچہ فدا اور نوازش کا بھی دوست ہی ہوا۔ پوری بات سننے کے بعد فدا حسین نے کہا۔

''یار ستار! ایک چھوٹے سے معاملے کو آپ لوگوں نے خوانخواہ مسئلہ کشمیر بنا رکھا ہے۔ فدا خاصا تنک مزاج اور غصیلا لڑکا ہے۔ اس قسم کے کیسوں میں سمجھانا بجھانا اور شرافت کی زبان استعمال کرنا کام نہیں آتا، کمانڈو ایکشن ضروری ہوتا ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' ستار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

نوازش علی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''کمانڈو ایکشن کا صاف صاف مطلب ہے، دماغ کا علاج۔ اس لڑکے کو ایک ٹھیک ٹھاک واٹ لگا دیتے ہیں اور اس مرمت کے دوران ہی اس پر یہ واضح بھی کر دیتے ہیں کہ یہ ٹریلر ہے۔ اگر اس کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا تو پھر بہت جلد یہ فلم ریلیز کر دی جائے گی۔ اس کی کٹی پھٹی لاش کسی بھی گڑھے یا گٹر سے برآمد ہو سکتی ہے۔''

ستار اگرچہ اپنے دل میں گوشی کے لئے بے پناہ نفرت پالے بیٹھا تھا، لیکن اس ہنگامی کارروائی کے تصور نے اسے تھوڑا پریشان کر دیا۔ اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''[illegible] پولیس کیس [illegible] تو کیا ہوگا؟''

''یار! تم پولیس والے کے بھائی کے دوست ہو اور کیس وغیرہ سے بھی ڈرتے ہو۔''

فدا حسین نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''رفیق کا بھائی شمشاد علی کب کام آئے گا؟''

''باہمی مشاورت سے یہ طے پایا کہ آج سہ پہر میں گوشی کو ایک خطرناک فلم کا ٹریلر دکھا ہی دیا جائے۔ رفیق نے ان سے کہا کہ اس کارروائی میں فدا اور نوازش حصہ لیں گے۔ جبکہ وہ بھی موقع پر موجود رہے، مگر لاتعلق سا۔ ستار نے انہیں بتایا تھا کہ گوشی روزانہ اس پارک میں کرکٹ کھیلنے آتا ہے۔ انہوں نے بیٹ اور وکٹس اٹھائے اور سہ پہر میں اس پارک میں پہنچ گئے۔ لیکن گوشی کی خوش قسمتی اور آفتاب کی بدقسمتی کہ یہ واقعہ پیش آیا۔ اگر آج گوشی کھیلنے کے لئے پارک میں آ جاتا تو یہ خاطر تواضع اس کے حصے میں آتی۔ انہوں نے شام تک گوشی کا انتظار کیا، لیکن جب وہ نہیں آیا اور آفتاب کی جھلک دکھائی دی تو محوِ انتظار فدا اور نوازش نے اپنا غصہ اسی پر نکال دیا۔ وجہ یہ تھی کہ آفتاب نے اپنے چھوٹے بھائی کو سمجھایا کیوں نہیں......؟

''اوہ......'' سائرہ بانو نے ایک بوجھل سانس خارج کی، پھر آفتاب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں بیٹا! کیا تمہیں ان معاملات کا علم تھا؟''

''جی امی!'' آفتاب نے بدستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب مجھے گوشی کی اس نازیبا حرکت کا پتہ چلا تو فوری طور پر مجھے یقین نہیں آیا۔ ادھر صغیر چاچا کی گلی میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ میں نے تصدیق کے لئے اس سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ واقعی گوشی اس گلی میں اکثر پایا جاتا ہے اور ایسے واقعات بھی سننے میں آئے ہیں کہ یہ لڑکا ستار کی بہن نزہت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے۔ میرے دوست نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں گوشی کو سمجھاؤں، ورنہ کوئی بھی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ کیونکہ ستار کا اُٹھنا بیٹھنا اچھے لڑکوں میں نہیں۔''

وہ چند لمحات کے لئے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں نے کوئی پندرہ دن پہلے، ایک مناسب سا موقع دیکھتے ہوئے گوشی سے بات کی تھی۔ پہلے تو وہ صاف مکر گیا کہ ایسی کوئی بات نہیں، ستار اس پر خوانخواہ الزام لگا رہا ہے۔ لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ میرے ایک دوست نے بھی اس کی حرکتوں

کی تصدیق کی ہے تو اس نے اپنے جرم کا اقبال کرتے ہوئے مجھ سے درخواست کی کہ میں امی کو........ یعنی آپ کو اس معاملے کی ہوا نہ لگنے دوں اور اس کے ساتھ ہی مجھ سے یہ وعدہ بھی کیا کہ آئندہ کبھی صغیر چاچا کی گلی میں قدم نہیں رکھے گا۔ لیکن آج والے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ میری نصیحت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔“

آفتاب خاموش ہوا تو سائرہ بانو نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ”آفتاب! اتنا کچھ ہوتا رہا اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔“

”امی! اس نے اتنی سنجیدگی سے وعدہ کیا تھا کہ میں یہی سمجھا، وہ سُدھر جائے گا۔“ آفتاب نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔ ”لیکن افسوس کہ........“

اے ایس آئی نے ان کی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے سائرہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”آنٹی! ہم نے اسی وقت ستار کو تھانے بلا لیا تھا بعد ازاں اعظم بستی سے رفیق کو بھی طلب کر لیا گیا۔ یہ ساری کہانی انہی کی زبانی پتہ چلی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے رفیق کا سب انسپکٹر بھائی شمشاد بھی تھانے چکر لگا کر گیا ہے۔ ساری صورتِ حال اب آپ کے سامنے ہے۔ بتائیں، کیا کرنا ہے؟“

”جب اپنی مرغی ہی گندا انڈا دے رہی ہو تو کسی کو کیا الزام دیا جا سکتا ہے؟“ سائرہ نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ”گوشی جو کچھ کر رہا ہے، وہ انتہائی بے ہودہ اور نامناسب ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اسے ایسا سمجھا دوں گی کہ آئندہ نزہت اور اس کے گھر والوں کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہو گی۔ لیکن بے قصور آفتاب کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے، اس کے بدلے میں ان لفنگوں کو کوئی سزا تو ملنی چاہئے نا۔“

”یہ کچھ مشکل نہیں ہے۔ ہم آپ کی شکایت اور آفتاب کی حالت کے پیشِ نظر باآسانی ایسا کر سکتے ہیں۔“ اے ایس آئی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن اس سے آپ کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔“

”وہ کیسے؟“ سائرہ بانو نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”وہ ایسے کہ........“ اے ایس آئی سرفراز شاہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اس وقت تو دوسری پارٹی صلح صفائی اور راضی نامے کی بات کر رہی ہے۔ نزہت کے باپ

اور بھائی کا کہنا ہے کہ اگر کسی قانونی کارروائی کا خیال دل سے نکال دیں اور آئندہ کے لئے گوشی کو اچھی طرح سمجھا دیں تو وہ بھی کوئی جوابی اقدام نہیں کریں گے۔ یہ معاملہ یہیں رفع دفع ہو جائے گا۔“

”ورنہ وہ کون سا جوابی قدم اُٹھائیں گے؟“ سائرہ پوچھے بِنا نہ رہ سکی۔

اے ایس آئی نے ٹھوس اور واضح الفاظ میں کہا۔

”آنٹی! اگر آپ مار پیٹ والے اس واقعے کو اچھال کر حملہ آوروں کو کوئی چھوٹی موٹی سزا دلوانا چاہیں گی تو جواباً نزہت کا باپ آپ کے بیٹے گوشی کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کروا دے گا، جس میں سنگین الزامات کی بھرمار ہو گی اور محلے کے چند معتبر افراد کے نام گواہوں کے طور پر شامل کئے جائیں گے۔ جس کے بعد ظاہر ہے، پولیس کو آپ کے بیٹے گوشی کے خلاف بھی کارروائی کرنا ہو گی اور یہ عین ممکن ہے، گوشی کچھ عرصے کے لئے جیل بھی چلا جائے۔“

وہ چند لمحات کے لئے تھما، پھر ڈرانے والے انداز میں بولا۔

”آنٹی! آپ کو تو پتہ ہے، ہماری جیلوں میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ کسی معمولی جرم میں مختصر سی سزا پا کر وہاں جانے والا جب واپس آتا ہے تو وہ ایک خطرناک مجرم کا روپ دھار چکا ہوتا ہے۔“

سائرہ بانو ایسی باتیں سن کر دہل گئی۔ وہ اپنے بیٹے کے مستقبل کے حوالے سے کسی ایسے جھگڑے پھڈے میں کودنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، جو آگے چل کر اس کی فیملی کی زندگیوں میں زہر بھر دے، لہٰذا ”راضی نامے“ اور ”رفع دفع“ پر اتفاقِ رائے ہو گیا۔

اے ایس آئی کو سائرہ کے گھر سے رخصت ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ گوشی آ گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ باہر کہیں کھڑا اس بات کا انتظار کر رہا تھا کہ اِدھر اے ایس آئی گھر سے قدم باہر نکالے، اُدھر وہ اندر داخل ہو۔

اس رات سائرہ بانو، سلمٰی اور آفتاب نے اپنے اپنے انداز میں گوشی کی جس طرح کلاس لی، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہر فیملی والا ان معاملات کو بہ خوبی سمجھ سکتا ہے۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ اس ”سیشن“ کے نتیجے میں گوشی نے کان پکڑ کر اور ناک سے دس لکیریں نکالنے کے بعد صدقِ دل سے وعدہ کیا کہ آج کے بعد وہ

کوئی بھی ایسا کام نہیں کرے گا، جس پر اس کی فیملی کے کسی بھی فرد کو شرمندگی اور ندامت کا سامنا کرنا پڑے۔

پھر گوشی نے اپنے وعدے پر عمل بھی کر دکھایا۔ آنے والے چند ماہ میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ اس دوران آفتاب کی ٹانگ کا پلاسٹر بھی کٹ گیا اور اس نے باقاعدہ آفس جانا بھی شروع کر دیا۔ پھر الیکشن کی گہما گہمی شروع ہو گئی۔ ستار اس مہم میں ایک سیاسی پارٹی کے لئے خاصا سرگرم تھا۔ پولنگ میں ابھی کئی دن باقی تھے کہ ایک رات ستار کو قتل کر دیا گیا۔ واقعات اور شواہد کی ڈور پکڑ کر پولیس سائرہ بانو کے گھر پہنچی اور گوشی کو ستار کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔

اور......اب وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا!

●......●......●

میں نے آئندہ پیشی سے پہلے جیل جا کر نصیر عرف گوشی سے ایک بھرپور ملاقات کر لی۔ اس سے میں نے وقوعہ کی رات پیش آنے والے واقعات کے بارے میں کرید کرید کر سوالات کئے اور جب تک مختلف پہلوؤں سے میری تسلی نہیں ہو گئی، میں نے اس کی جان نہیں چھوڑی۔ آخر میں وکالت نامے اور دیگر ضروری کاغذات پر دستخط کروانے کے بعد میں وہاں سے آ گیا۔

مقررہ روز میں عدالت کے کمرے میں حاضر تھا۔ پچھلی پیشی پر سائرہ بانو نے پہلے والے وکیل کو فارغ کر دیا تھا اور اب میں گوشی کا دفاعی وکیل یعنی وکیل صفائی تھا۔ مجھے اس کیس میں اپنے مؤکل کا دفاع کرتے ہوئے اسے عدالت سے باعزت بری کروانا تھا سائرہ بانو کی زبانی مجھے اب تک کی عدالتی کارروائی کے بارے میں پتہ چل چکا تھا، لہٰذا میں ذہنی طور پر پیش قدمی کے لئے تیار تھا۔ یہ کیس اب ہاتھ کی لکیروں کے مانند میرے سامنے واضح تھا۔

جج کرسیٔ انصاف پر آ کر بیٹھا تو عدالت کی کارروائی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ملزموں والے کٹہرے میں میرا مؤکل گردن جھکائے کھڑا تھا۔ جج نے حسب دستور فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم گوشی نے صحت جرم سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد ملزم کا تفصیلی

بیان ریکارڈ کیا گیا۔

استغاثہ کی جانب سے آٹھ گواہوں کی فہرست پیش کی گئی تھی۔ میں نے باری باری ان سب پر بڑی کڑی جرح کی، لیکن میں یہاں پر صرف ان شہادتوں کا ذکر کروں گا، جو میری نظر میں اہمیت کی حامل ہیں۔

ملزم کے بیانِ حلفی کے اختتام پر وکیل استغاثہ نے اسے گھیر لیا۔ وہ اکیوزڈ باکس کے قریب پہنچا، پھر جج کی اجازت سے اس نے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔

"گوشی......!" اس نے ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کس قسم کا نام ہے؟"

"میرا نام نصیر ہے۔" گوشی نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "گوشی تو پیار میں پکارا جانے والا گھریلو نام ہے۔"

میں نے گوشی کو بڑی اچھی طرح یہ بات سمجھا دی تھی کہ وکیل استغاثہ کی جرح کا پوری طرح ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے۔ کسی بھی مرحلے پر گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ بے گناہ ہے، لہٰذا کوئی اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں ہر قدم پر اس کی مدد کے لئے عدالت میں موجود رہوں گا۔ میری اس ناصحانہ تسلی کا اس پر بڑا صحت مند اثر ہوا تھا اور وہ پوری طرح فارم میں دکھائی دیتا تھا۔

وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اچھا......میں تو یہ سمجھا تھا کہ تم چونکہ کسی بھی نصیحت پر بالکل دھیان نہیں دیتے ہو، اس لئے تمہارا نام مذاقاً "گوشی......یعنی گوش کے بغیر۔" والا رکھ دیا گیا ہے اور یہ بات تو تم نے بڑی اہم بتائی ہے۔"

وہ متوقف ہوا، پھر ڈرامائی انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"گوشی چونکہ تمہارا پیار کا نام ہے، شاید اسی لئے تمہیں پیار، محبت اور عشق وغیرہ کا بھی بہت زیادہ شوق ہے نا......میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں یا درست، اس کا تو مجھے پتہ نہیں، البتہ......" گوشی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ پیار، محبت اور عشق کرنا جرائم میں شمار نہیں ہوتا۔"

"لیکن کسی کی ناپسندیدگی اور مرضی کے خلاف نہایت ہی واہیات انداز میں کوئی حرکت کرنا اور اس حرکت کو محبت کا نام دینا بہت بڑا جرم ہے۔" وکیل استغاثہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تم سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

"آپ کا فلسفہ میری سمجھ سے بہت زیادہ باہر ہے، وکیل صاحب!" گوشی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "اور آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں، اس کا آپ ہی کو پتہ ہوگا۔"

وکیل استغاثہ نے ایک گہری سانس خارج کی اور ملزم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا تم اس بات سے انکار کرو گے کہ ماضی قریب میں تم مقتول کی گلی کے بڑے چکر لگایا کرتے تھے؟"

"محلّوں کے اندر گلیاں چلنے پھرنے اور گزرنے کے لئے بنائی جاتی ہیں، وکیل صاحب!" گوشی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "انہی گلیوں کے ذریعے انسان محلے کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک آ جا سکتا ہے۔ اگر میں مقتول کی گلی میں سے گزرتا رہا ہوں تو اس میں ایسی حیران ہونے والی کون سی بات ہے؟"

"حیران ہونے والی بات ہے۔" وکیل استغاثہ نے معاندانہ نظروں سے میرے مؤکل کو گھورا۔

گوشی جس بے باک انداز میں وکیل استغاثہ کی جرح کا مقابلہ کر رہا تھا، وہ وکیل مذکور کے لئے حیرت کے ساتھ ساتھ تکلیف کا بھی باعث تھا۔ عدالتی کارروائی کے دوران عموماً ملزم کسی بے زبان گائے کا کردار ادا کرتا ہے۔ اور وکیل مخالف کی جارحانہ جرح کے سامنے اسے دم مارنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن گوشی میری ہدایات کی روشنی میں جس طرح ڈٹ کر کھڑا تھا، وہ وکیل استغاثہ کو ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنی ادھوری بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"گلیاں انسانوں کی گزرگاہیں ضرور ہوتی ہیں، لیکن انہیں سیر و تفریح کے لئے پارک نہیں بنانا چاہئے۔ کیا تم معزز عدالت کو بتاؤ گے کہ تم آئے دن مقتول کی گلی کے چکر کیوں لگایا کرتے تھے؟ کیا تمہیں مقتول سے کسی خاص قسم کی محبت ہوگئی تھی؟"

"آپ کا جو جی چاہے، سمجھ لیں۔" گوشی نے مبہم سا جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ "مقتول سے یا...... اس کی بہن سے؟"

"مقتول تو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔" گوشی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کی بہن کو عدالت میں بلا کر یہ سوال اس کے سامنے رکھ سکتے ہیں۔ آپ کو خاصا تشفی بخش جواب مل جائے گا۔"

"اگر ضرورت محسوس ہوئی تو مقتول کی بہن نزہت کو تمہارے خلاف عدالت میں بیان دینے کے لئے طلب کیا جائے گا۔" وکیل استغاثہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "فی الحال تو تم یہاں موجود ہو۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ تمہاری اور مقتول کی دشمنی کا آغاز کب ہوا تھا؟"

"ہمارے درمیان کبھی کوئی باقاعدہ دشمنی نہیں رہی۔" گوشی نے کہا۔

"بے قاعدہ دشمنی تو رہی ہوگی؟"

"ایسی بھی کوئی بات نہیں۔"

"ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" وکیل استغاثہ نے ملزم کے الفاظ دہرائے، پھر تیکھے انداز میں کہا۔ "وہ کیا معاملہ تھا، جس کے نتیجے میں مقتول کے دوستوں نے ایک پارک میں تمہارے بڑے بھائی آفتاب کو بیٹ اور وکٹوں سے زدوکوب کیا تھا اور وہ بے چارہ قربانی کا بکرا اپنی ٹانگ تڑوا کر ہسپتال پہنچ گیا تھا؟"

"ان لوگوں نے میرے بھائی سے سراسر زیادتی کی تھی۔" گوشی نے برہمی سے کہا۔

"اور یہ سراسر زیادتی تمہارے کسی سراسر کارنامے کا نتیجہ تھی...... ہوں؟"

"میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" گوشی نے ڈپلومیٹک جواب دیا۔

"تم کچھ کہنا چاہو یا نہیں، مگر میں اس سلسلے میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔" وکیل استغاثہ نے سخت انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس کا روئے سخن جج کی جانب مڑ گیا۔

"جنابِ عالی! ملزم نہایت ہی چھچھورا اور واہیات حرکتوں کا مرتکب رہا ہے۔ یہ مقتول کی گلی کے چکر اس لئے کاٹا کرتا تھا کہ اس کی بہن نزہت کو چھیڑنا اور مختلف حیلوں بہانوں سے تنگ کرنا مقصود ہوتا تھا۔ مقتول نے ایک دو مرتبہ اسے سمجھانے کی

کوشش کی، لیکن یہ ایسی نازیبا حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ حتیٰ کہ اس کے بڑے بھائی سے اس معاملے کی شکایت بھی کی گئی، مگر اس آوارہ اور لفنگے شخص پر رتی برابر اثر نہ ہوا۔ چنانچہ مقتول نے اپنے دوستوں کی مدد سے اس کی ٹھیک ٹھاک ٹھکائی کا پروگرام بنا ڈالا۔ لیکن بدقسمتی سے آفتاب ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا اور بے چارہ زخموں سے چور ہو کر ہسپتال پہنچ گیا۔ اس واقعے میں مقامی تھانے کو بھی ملوث ہونا پڑا۔ دونوں طرف کی غلطیوں اور زیادتیوں کو دیکھتے ہوئے تھانے نے دونوں پارٹیوں کو صلح صفائی اور راضی نامے پر تیار کر کے اس معاملے کو رفع دفع کر دیا۔ متعلقہ تھانے کے ریکارڈ سے اس امر کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔"

"تصدیق ہو گئی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پھر...... اس واقعے کا زیر سماعت کیس سے کیا تعلق ہے؟"

"تعلق ہے...... اور بڑا گہرا تعلق ہے۔" وکیل استغاثہ نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا۔

"کیا آپ اس تعلق کے بارے میں جانتے ہیں، میرے فاضل دوست؟"

اس نے معاندانہ نظروں سے مجھے گھورا اور بولا۔

"ہاں...... میں جانتا ہوں۔"

"ویری گڈ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "کیا آپ اس سلسلے میں میرے علم میں اضافہ فرمائیں گے؟ اور...... میرا خیال ہے، معزز عدالت بھی اس راز کو ضرور جاننا چاہے گی۔"

جج نے وکیل استغاثہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وکیل صاحب! اگر آپ ایسی کسی اہم حقیقت سے واقف ہیں تو اسے عدالت کے ریکارڈ پر لایا جائے۔"

وکیل استغاثہ نے ایک نظر حاضرین عدالت کو دیکھا، گہری سانس خارج کی اور بڑے ڈرامائی انداز میں بتانے لگا۔

"یور آنر! ملزم ایک کینہ پرور اور منتقم مزاج شخص ہے۔ اس کے بھائی کو بری طرح زدوکوب کیا گیا تھا اور پولیس نے نزہت کے حوالے سے خود اسے بھی بڑا ذلیل کیا تھا۔

یہ اس واقعے کو بھولا نہیں، حالانکہ اس معاملے میں غلطی سراسر اسی کی تھی۔ لیکن یہ انتقامی انداز میں سوچنے لگا، بڑی خاموشی کے ساتھ اس نے منصوبہ بندی شروع کر دی کہ کسی طرح مقتول کو سبق سکھایا جائے، جس کی وجہ سے اسے ہزیمت اٹھانا پڑی اور اس کے بڑے بھائی سے بھی مار پیٹ کی گئی اور پھر کئی مہینوں کے بعد اسے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے ایک موقع مل گیا۔"

وکیل استغاثہ اپنی سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوا تو میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں فوراً سوال داغ دیا۔

"میرے فاضل دوست! کیا اس سلسلے میں میرے مؤکل نے آپ کو اپنا رازدار بنایا تھا یا پھر اس انتقامی راز کی خبر آپ کو کہیں اور سے ملی ہے؟"

"نہ رازدار بنایا اور نہ ہی کسی اور شخص نے مجھے مطلع کیا ہے۔" وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ "یہ ملزم کے نفسیاتی تجزیے کا عکس ہے، میں اس کی انتقامی سوچ کو اُجاگر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"خاصی غیر مناسب سی کوشش ہے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا، پھر پوچھا۔

"میرے فاضل دوست! آپ نے ملزم کے نفسیاتی تجزیے کے عکس کی بات کی ہے۔ کیا آپ معزز عدالت کو بتانا پسند فرمائیں گے کہ آپ ماہر نفسیات بھی ہیں؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

میں نے اسی طنزیہ تسلسل میں کہا۔

"تو پھر اس سلسلے میں آپ نے باقاعدہ کسی ماہر نفسیات سے رجوع کیا ہوگا۔ کیا آپ مذکورہ ماہر نفسیات کی جاری کردہ رپورٹ عدالت میں پیش کر سکتے ہیں؟"

"آپ تو ماہر نفسیات کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں، وکیل صاحب......!" وہ چڑ کر بولا۔

میں نے بغیر چڑے کہا۔

"اور آپ بھی تو میرے مؤکل کو موت کے کنوئیں میں دھکیلنے کے لئے، ہاتھ پاؤں دھوئے بغیر سرپٹ بھاگ رہے ہیں اور بگ ٹٹ دوڑ رہے ہیں۔ اگر آپ کو جواب دینے میں کوئی تامل تھا تو علم نفسیات کو بیچ میں لانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

"میں نے تو ملزم کی سوچ کی عکاسی کرنے کے لئے اس کا ایک نفسیاتی پہلو بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر آپ کو یہ ذکر پسند نہیں آیا تو میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"جس شے کے بارے میں مکمل معلومات نہ ہوں، اسے چھیڑنا ٹھیک نہیں ہوتا، وکیل صاحب!" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر جج کی سمت دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ "جنابِ عالی! وکیل استغاثہ نے میرے مؤکل کی نفسیات کے بارے میں، ابھی معزز عدالت کے سامنے جو موشگافیاں کی ہیں، ان کا نہ تو کوئی سر پاؤں ہے اور نہ ہی منہ متھا۔ یہ بات وہ خود بھی تسلیم کر رہے ہیں کہ بس، یہ سب ایسے ہی انہوں نے کہہ دیا ہے۔ لہٰذا ان کے کہے کو راست نہ جانا جائے۔ یہ محض ٹائم پاس تھا........ ایسی باتوں کو اس ریفرنس کے ساتھ عدالت کے ریکارڈ پر لانے کی ضرورت ہے کہ بعض اوقات استغاثہ کی جانب سے معزز عدالت کا قیمتی وقت کتنی بے دردی اور بے ہنگم انداز میں برباد کیا جاتا ہے۔"

میں نے عدالتی کارروائی کے ابتدا ہی میں کچھ اس انداز سے، وکیل استغاثہ کو آڑے ہاتھوں لیا تھا کہ وہ پریشان ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔ لیکن میں اسے اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ جج کی جانب سے ایک مرتبہ پھر میں نے اپنا رخ وکیل استغاثہ کی طرف موڑا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"وکیل صاحب! تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے مؤکل کے خیالات اور سوچ کی فرضی اور اوٹ پٹانگ ترجمانی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ملزم کسی موقع کی تلاش میں تھا اور پھر وقوعہ کی رات اسے اپنا مقصد پورا کرنے کا موقع مل گیا۔ کیا یہاں پر "مقصد پورا کرنے" سے آپ کی مراد مقتول ستار کا قتل ہے؟"

"جی........ میرا اشارہ اسی جانب تھا۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہوں........" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ "کیا ملزم نے قتل کی یہ واردات آپ کی نظروں کے سامنے کی تھی؟"

"میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔" وہ بُری طرح اُچھلا۔

"آپ نے جتنے وثوق سے "مقصد پورا کرنے" کی بات کی ہے، اس سے تو یہی تاثر اُبھرتا ہے کہ یہ اندوہ ناک واقعہ آپ کی آنکھوں کے سامنے پیش آیا تھا۔"

میں نے نمک پاشی کرتے ہوئے کہا۔ "اس حوالے سے آپ معزز عدالت کو کچھ بتانا پسند کریں گے؟"

"میں نے واقعاتی شواہد اور استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کی روشنی میں یہ بات کی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"یہ اہم واقعاتی شواہد آپ کب عدالت میں پیش کریں گے؟"

"جب انہیں پیش کرنے کا مناسب موقع آئے گا۔" وہ بیزاری سے بولا۔

"اوکے........" میں نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیئے۔

وکیل استغاثہ نے ملزم پر جرح سے اپنی کارروائی کا آغاز کیا تھا۔ لیکن میں نے بیچ میں اسے ایسے اُچک لیا کہ وہ میرے مؤکل کو بھول کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش میں لگ گیا۔ میں نے چند اہم پوائنٹس عدالت کے علم میں لانے کے بعد اس کی "جان" چھوڑ دی۔

اس کے بعد استغاثہ کی جانب سے مقتول کے باپ صغیر چاچا کباب فروش کو گواہی کے لئے وٹنس باکس تک لایا گیا۔ جب اس کے بیانِ حلفی کو ریکارڈ کرنے کی باری آئی تو وہ بے حد جذباتی ہو گیا۔ صغیر کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ عام سی صورت کا مالک ایک پستہ قامت شخص تھا۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے، جن کی سفیدی کو چھپانے کے لئے وہ بالوں میں مہندی لگاتا تھا۔ بیٹے کی موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ صغیر احمد کی صرف دو ہی اولادیں تھیں۔ نزہت اور ستار۔ ستار کے قتل کے بعد تو صرف نزہت ہی رہ گئی تھی۔

وہ ایسا آبدیدہ ہوا کہ اس کا بیان ریکارڈ کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ جج نے وکیل استغاثہ سے کہا۔

"آپ کے گواہ کو آرام کی ضرورت ہے۔ آپ اسے اگلی پیشی کے لئے رکھ لیں۔ فی الحال کوئی دوسرا گواہ بھگتا لیں۔"

وکیل استغاثہ نے کہا۔ "جنابِ عالی! آج کوئی دوسرا گواہ میسر نہیں ہے۔ آپ آئندہ پیشی کی تاریخ دے دیں۔"

میں نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں

ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ اس سے پہلے کہ جج کچھ بولتا، میں نے جلدی سے کہا۔

"جنابِ عالی! عدالت کے مقررہ وقت کا کچھ حصہ ابھی باقی ہے۔ اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں چند ایک سوالات اس کیس کے انکوائری آفیسر سے کرنا چاہتا ہوں۔"

میری اس بے ضرر اور ننھی سی خواہش کو پورا کرنے پر عدالت کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا جج نے مجھے اس کام کی اجازت دے دی۔ کسی بھی زیرِ ساعت کیس کا تفتیشی افسر عدالتی کارروائی کے دوران میں ہر پیشی پر عدالت کے کمرے میں موجود ہوتا ہے۔ میرا مطلوبہ شخص اگلے ہی لمحے وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کیس کے آئی۔ او کا نام موسیٰ خان تھا۔ وہ عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ جسم مائل بہ فربہی، درمیانہ قد اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ۔ اس کی عمر چالیس کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ اس عمر میں اتنا موٹا نظر کا چشمہ حیرت کی بات تھی۔ یا تو اس نے اپنی آنکھوں کا بڑی "بے دردی" سے استعمال کیا تھا اور یا یہ پھر کسی بیماری کے ثمرات تھے۔

میں نے انکوائری آفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"خان صاحب! آپ ہی کے تھانے کے ایک اے ایس آئی سرفراز شاہ صاحب پہلے بھی اس کیس کے پس منظر کے حوالے سے ملزم کے گھر انکوائری کے لئے آ چکے ہیں۔ اگر اب انہی شاہ صاحب کو یہ فریضہ سونپ دیا جاتا تو پولیس کا کام قدرے آسان نہ ہو جاتا؟"

"بات تو آپ کی سولہ آنے ٹھیک ہے، وکیل صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن شاہ جی آج کل کراچی میں ہیں نہیں۔ وہ لمبی چھٹی پر اپنے گاؤں واقع ہری پور ہزارہ گئے ہوئے ہیں۔ ان کی شادی ہونے والی ہے، بلکہ....... چند روز پہلے یہ شادی ہو بھی چکی ہے۔"

"پھر تو مجبوری ہے۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ پھر پوچھا۔ "خان صاحب! اب ہم زیرِ ساعت کیس کی طرف آتے ہیں۔ کیا آپ معزز عدالت کے روبرو یہ بتانا پسند کریں گے کہ اس واقعے کی اطلاع آپ کو کب اور کس نے دی تھی؟"

اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور جواب دیا۔

"اس واقعے کی اطلاع دو طرف سے ہوئی تھی، یعنی پہلے کوئی لگ بھگ ساڑھے دس بجے اشفاق حسین نامی ایک شخص نے تھانے فون کر کے بتایا کہ ابھی ابھی اس نے اپنے گھر کے قریب فائرنگ کی آواز سنی ہے۔ فون ریسیو کرنے والے نے جب اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ تو اس نے گرین بیلٹ کے علاقے کا نام لیا اور کہا کہ اس کا گھر نالے سے قریب ہی ہے اور فائرنگ کی مذکورہ آواز اسی جانب سے آئی ہے۔" انکوائری آفیسر نے تھوڑا توقف کیا، ایک بوجھل سانس خارج کی اور سلسلۂ وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ہم نے اطلاع دینے والے کی بات پر زیادہ توجہ نہیں دی، مگر کچھ ہی دیر کے بعد صغیر احمد کباب فروش تھانے پہنچا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا اور پریشان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے بیٹے کو ملزم گوشی نے قتل کر دیا ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا ہے؟ تو اس کا جواب تھا کہ تھوڑی دیر پہلے قتل کی یہ واردات گرین بیلٹ کے علاقے میں نالے کے قریب پیش آئی ہے۔ صغیر احمد کے بیان سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے اشفاق حسین نامی شخص نے فائرنگ کی جو آواز سنی تھی، وہ اسی واردات کے حوالے سے تھی۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور صغیر احمد کباب فروش کے ساتھ جائے وقوعہ کی جانب روانہ ہو گیا....... یہ ہے ساری کہانی جناب!"

"کہانی ابھی تمام نہیں ہوئی، خان صاحب!" میں نے انکوائری آفیسر موسیٰ خان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو بہت سی باتیں، بہت سی وضاحتیں باقی ہیں۔"

"مثلاً.......؟" اس نے اُلجھن زدہ انداز میں آنکھیں جھپکائیں۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جب کوئی شخص تھانے فون کر کے کسی اہم واقعے کی اطلاع دیتا ہے تو طریق کار کے مطابق، اس کا نام، ٹیلی فون نمبر اور محلِ وقوع دریافت کیا جاتا ہے۔ جب وہ ان سوالات کے تسلی بخش جوابات دے دیتا ہے تو فون بند کر کے، تھانے سے اسی نمبر پر

مذکورہ شخص کو فون کیا جاتا ہے، تاکہ یہ تصدیق کی جا سکے کہ وہ شخص کہیں غلط بیانی سے کام لے کر پولیس کو بھٹکانا تو نہیں چاہتا۔‘‘

میں نے تھوڑا توقف کیا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

’’کیا آپ نے بھی اس طریق کار پر عمل کیا تھا؟‘‘

’’جی ہاں........ بالکل کیا تھا۔‘‘ وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ’’اس شخص کا نام، فون نمبر اور گھر کا مکمل ایڈریس نوٹ کر لیا گیا تھا۔ اس کے بنگلے کا نمبر جی۔ ایک سو پچیس تھا۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے، وہ گرین بیلٹ کے علاقے میں رہتا تھا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور آئی۔او کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’خان صاحب! جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے آپ نے بتایا ہے کہ........ ہم نے اطلاع دینے والے کی بات پر زیادہ توجہ نہیں دی........ ایسا کیوں؟ ایک شخص خاص طور پر تھانے فون کر کے آپ کو فائرنگ کی اطلاع دے رہا ہے اور آپ اس کی بات پر توجہ نہیں دے رہے۔ اس عدم توجہی کی وضاحت فرمائیں گے آپ؟‘‘

’’وہ جناب........ بات دراصل یہ ہے کہ........‘‘ وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ’’ان دنوں الیکشن کا زور عروج پر تھا، جگہ جگہ جلسے ہو رہے تھے اور آتش بازی وغیرہ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اسی حوالے سے ہوائی فائرنگ وغیرہ بھی سننے میں آ جاتی تھی۔ ہم بھی یہی سمجھے کہ شاید اشفاق حسین نے بھی ایسی ہی کوئی آواز سنی ہوگی۔ ادھر نزدیک ہی، ایڈمنسٹریشن سوسائٹی میں اس دن ملک کی ایک بڑی سیاسی پارٹی کا زوردار جلسہ بھی تھا اور........‘‘

’’جلسہ زوردار تھا یا کم زور........‘‘ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ’’اور وہ سیاسی پارٹی بڑی تھی یا چھوٹی، اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا، آئی۔او صاحب! آپ کی یہ لنگڑی وضاحت میرے سوال کا متشفی جواب نہیں ہے۔‘‘

میں نے تھوڑا توقف کیا، پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

’’آپ نے اپنے فرائض میں کوتاہی کیوں برتی، جناب؟‘‘

ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کئے بغیر اس نے محفوظ معتدل راہ اختیار کرتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

’’آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، وکیل صاحب! پولیس کو اشفاق حسین کی فون کال پر عملی کارروائی دکھانا چاہئے تھی۔‘‘

’’آپ خاصے معقول پولیس والے ہیں۔‘‘ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں نے تعریفی انداز میں کہا، پھر پوچھا۔ ’’کیا مقتول کے باپ صغیر احمد نے تھانے میں آ کر یہی بتایا تھا کہ اس کے بیٹے ستار کو ملزم گوشی نے قتل کر دیا ہے؟‘‘

’’جی ہاں، اس نے روتے ہوئے یہی اطلاع دی تھی۔‘‘ انکوائری آفیسر نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ’’میں اس وقت تھانے کے اندر موجود تھا۔ یہ اطلاع پاتے ہی میں نے ایک مستعد کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔‘‘

’’آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ مقتول کا باپ صغیر چاچا یہ اطلاع لے کر کتنے بجے تھانے پہنچا تھا؟‘‘ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

’’اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’ابتدائی پوچھ تاچھ میں آپ نے اس سے سوال تو کیا ہوگا کہ اسے اس واقعے کے بارے میں کیسے علم ہوا؟‘‘ میں نے معتدل لہجے میں پوچھا۔

’’جی ہاں!‘‘ اس نے گردن کو اثباتی جنبش دی۔ ’’آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے صغیر احمد کی جذباتی کیفیت ملاحظہ فرمائی ہے۔ مجبوراً اسے عدالت کے کمرے سے باہر بھیجنا پڑا ہے۔ اس روز صغیر کی اس سے بھی زیادہ بری حالت تھی۔ بہرحال........‘‘

وہ لمحاتی توقف کے بعد اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

’’بہرحال، روتے دھوتے ہوئے اس نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ اس واردات کا علم اسے مقتول کے ایک گہرے دوست زبیر سے ہوا تھا، جو ستار کی موت سے چند لمحے پہلے اس کے ساتھ ہی تھا۔ زبیر نامی وہ نوجوان صغیر احمد کے ساتھ ہی تھانے پہنچا تھا۔‘‘

’’اوہ........!‘‘ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ’’یہ زبیر وہی لڑکا تو نہیں، جس کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں بھی شامل ہے؟‘‘

’’جی ہاں........ جی ہاں۔‘‘ اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے اگلا سوال کیا۔ ’’آپ موقع واردات پر کتنے بجے پہنچے تھے؟‘‘

"گیارہ بیس پر۔" اس نے مختصراً بتایا۔

"وہاں آپ نے کیا دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"اگر آپ نے محمود آباد کا علاقہ دیکھا ہے تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ تمام ڈھلوان گلیاں پیچھے نالے کی طرف آتی ہیں۔ نالے کی دوسری جانب گرین بیلٹ کا علاقہ پھیلا ہوا ہے۔ جائے وقوعہ دراصل مذکورہ نالے کا کنارہ ہی تھی۔ میں نے نالے کے کنارے پلیا کے نزدیک مقتول ستار کی لاش پڑی دیکھی۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گرا ہوا تھا۔ اس جگہ پر زیادہ روشنی نہیں تھی۔ قریب واقع بنگلوں کی طرف سے آنے والی روشنی نے اس مقام کو ملگجا رکھا تھا۔ بہرحال، میں ستار کے دوست زبیر کی راہ نمائی میں جائے واردات پر پہنچا اور موقع کی ضروری کارروائی نمٹا دی۔"

یہاں تک بتانے کے بعد وہ سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"زبیر کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ مقتول اور وہ ایک ساتھ ہی تھے۔ پھر ملزم ان کے پاس پہنچا اور خواہش ظاہر کی کہ وہ مقتول سے تنہائی میں چند منٹ بات کرنا چاہتا ہے۔ زبیر ان سے تھوڑے فاصلے پر چلا گیا، تاکہ وہ اطمینان سے بات کرسکیں۔ لیکن ملزم، مقتول کو کچھ اور آگے پلیا کے پاس لے گیا۔ پھر پانچ چھ منٹ کے بعد زبیر نے دو فائروں کی آواز سنی۔ وہ چونک کر ان کی جانب دوڑا۔ لیکن اسے صرف مقتول زمین پر اوندھا پڑا دکھائی دیا۔ ملزم ایک قریبی گلی میں غائب ہو چکا تھا۔ اس صورتِ حال نے زبیر کو بوکھلا دیا اور وہ دوڑا دوڑا اصغیر احمد کی دکان پر پہنچا، جو رات کو بارہ ایک بجے تک کھلی رہتی تھی۔ اس نے اس واقعے کے بارے میں مقتول کے باپ کو بتایا، پھر وہ دونوں سیدھے تھانے چلے آئے۔"

اس کا مطلب ہے، استغاثہ کا گواہ زبیر نہایت ہی اہم آدمی ہے۔ جب وہ گواہی کے لئے وٹنس باکس میں آئے گا تو اس سے سوال و جواب کا خوب مزہ آئے گا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا، پھر آئی۔او سے پوچھا۔

"لاش کے ابتدائی معائنے سے آپ کے ذہن میں کیا نقشہ بنا؟"

"فائر بہت ہی قریب سے کئے گئے تھے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "مقتول کا

سینہ خون سے تر بہ تر تھا۔ بادی النظر میں یہی دکھائی دیتا تھا کہ گولیاں مقتول کے دل میں پیوست ہوئی ہیں۔ بعد ازاں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے یہ واضح کر دیا کہ ایک گولی مقتول کے دل میں پیوست ہوئی تھی اور دوسری گولی نے اس کے پھیپھڑے کو پھاڑ ڈالا تھا۔ لہٰذا فوری طور پر اس کی موت واقع ہوگئی۔ میں نے موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال پہنچوا دیا تھا۔"

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق، مقتول ستار کی موت یکم مئی کی رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب وہی تھا، جو انکوائری آفیسر نے بیان کیا تھا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آلۂ قتل کے بارے میں آپ کیا کہیں گے، خان صاحب؟"

"مقتول کے جسم سے برآمد ہونے والی گولیاں اعشاریہ تین چھ کیلی بر کی تھیں۔" اس نے بتایا۔ "اور یہ پسٹل سے فائر کی گئی تھیں۔"

"کیا آپ مذکورہ پسٹل کو برآمد کرنے میں کامیاب ہوگئے؟"

"نہیں جناب!" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "باوجود کوشش کے، ابھی آلۂ قتل برآمد نہیں ہوسکا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ واردات کے بعد ملزم نے پسٹل کو نالے میں پھینکا اور خود گلی میں روپوش ہوگیا۔"

"آپ نے ملزم کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا تھا؟" میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "اور وقت لگ بھگ ساڑھے بارہ کا تھا۔"

"ساڑھے بارہ دن یا رات؟"

"جب قتل کی واردات رات کو ہوئی تھی تو ظاہر ہے، ملزم کی گرفتاری بھی رات ہی کو ہوئی ہوگی۔" وہ قدرے بے زاری سے بولا۔

میں نے کہا۔

"یہ کوئی فارمولا نہیں ہے۔ بعض اوقات قاتل کی گرفتاری کے لئے مہینوں اور سالوں لگ جاتے ہیں، آپ تو رات اور دن کی بات کر رہے ہیں۔"

وہ خاموش رہا۔ میں نے آخری سوال کیا۔

''موسیٰ خان صاحب! آپ نے ایک ذمے دار شہری کی کوشش کو بھی سراہنے کی زحمت گوارا کی یا نہیں؟''

''آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔

''میرا اشارہ اشفاق حسین کی طرف ہے، جس نے تھانے فون کر کے آپ کو مطلع کیا تھا کہ اس کے گھر کے پاس دو فائروں کی آواز گونجی ہے۔''

''اوہ........ ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اشفاق حسین سے جائے وقوعہ پر ہی ملاقات ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی کوشش پر تہہ دل سے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اس کے مطابق، وہ اس وقت اپنے گھر کی چھت پر تھا، جب یکے بعد دیگرے دو گولیاں فائر ہوئیں۔ وہ چھت سے نیچے اُترا اور گھر کے اندر آ کر اس نے پولیس اسٹیشن فون کر دیا۔''

وہ لمحے بھر کو سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوا، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے اشفاق حسین کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس نے تھانے فون کر کے ایک بہت بڑی ذمے داری نبھائی ہے۔ ہم لوگ اسی کی اطلاع پر یہاں پہنچے ہیں۔''

آئی۔او کے یہ الفاظ کہ........ فائرنگ کے وقت اشفاق حسین اپنے گھر کی چھت پر موجود تھا، مجھے چونکا دینے کے لئے کافی تھے۔ لیکن میں نے اپنے اندرونی تاثرات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور طنزیہ لہجے میں موسیٰ خان سے کہا۔

''خان جی! آپ آخر پولیس والے ہیں نا، کریڈٹ لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اس بے چارے کی بروقت اطلاع کو آپ لوگوں نے درخورِ اعتنا نہیں جانا اور بعد میں اسی سے کہہ رہے ہیں کہ اسی کی اطلاع پر دوڑے دوڑے آئے ہیں؟''

وہ جواب دینے کے بجائے معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے

کر عدالت برخاست کرنے کا حکم سنا دیا۔

●......●......●

ہم عدالت سے باہر آئے تو آفتاب نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''بیگ صاحب! آج کی کارروائی بڑی بھرپور رہی ہے۔ میں نے کیس کے رُخ کو مڑتے ہوئے محسوس کر لیا ہے۔''

اس روز سائرہ بیگم نہیں آئی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ایسا تو ہے........ لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ کیس کا رخ کس سمت میں مڑ رہا ہے؟''

''ہمارے حق میں مڑ رہا ہے، جناب!'' وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ ''بس آپ کو زبیر پر فوکس کرنا ہو گا۔ اگر اس کردار پر محنت کی گئی تو مجھے پوری اُمید ہے کہ گوشی کی بے گناہی ثابت کرنے کی کوئی محفوظ راہ نکل آئے گی۔''

اس کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا۔

''زبیر پر فوکس کرنے کی کیوں ضرورت ہے؟''

ہم چلتے ہوئے پارکنگ لاٹ میں کھڑی میری گاڑی کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اس نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔

''بیگ صاحب! یہ لڑکا مجھے گڑبڑ لگتا ہے۔''

''کیا گڑبڑ لگتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بتانے لگا۔

''اس کی اور مقتول ستار کی دوستی میری سمجھ سے باہر ہے۔ ٹھیک ہے، وہ بھی گیٹ پر ہی رہتا ہے۔ لیکن سیاسی اور نظریاتی اعتبار سے وہ مخالف دھڑے کا بندہ ہے اور میں نے سنا ہے، اس کا اُٹھنا بیٹھنا جرائم پیشہ افراد میں ہے۔ اصولی طور پر ان دونوں کی دوستی سمجھ میں نہیں آتی۔''

''تم سوچ تو صحیح رہے ہو، لیکن اس دنیا میں اصول قاعدے بہت ہی کم بروئے کار

نظر آتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم مقتول ہی کو دیکھ لو، اس نے اپنے غنڈا عناصر دوستوں سے کس طرح تمہاری ''خاطر داری'' کرائی تھی!''

''اب آپ میرے نکتے تک پہنچ گئے ہیں، بیگ صاحب!'' وہ اضطراری انداز میں بولا۔ ''آپ نے ابھی مقتول کے جن جرائم پیشہ دوستوں کا ذکر کیا ہے نا، انہی کی وجہ سے میں کہہ رہا ہوں کہ مقتول اور زبیر میں کوئی ملاپ نہیں ہونا چاہئے۔''

وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''مقتول کے خیر خواہ اور زبیر کی پارٹی دو مخالف سیاسی دھڑے ہیں، جن کا آپس میں اینٹ کتے کا بیر ہے۔ جبھی تو میرا دماغ اس بات کو قبول نہیں کر پا رہا کہ وقوعہ کی رات مقتول اور زبیر ایک ساتھ گرین بیلٹ کے علاقے میں موجود تھے...... پھر یہ بات کہ گوشی، مقتول سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا تھا، منطقی طور پر درست نظر نہیں آتی۔ کیونکہ ان دونوں میں اتنے اچھے مراسم کبھی نہیں رہے تھے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مراسم تھے ہی نہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ آپ تو اس معاملے کے پس منظر سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔ اس روز پارک کے قریب میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ گوشی کے لئے ناقابلِ فراموش نہیں ہوسکتا۔ مقتول اور گوشی کے بیچ روابط کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بیگ صاحب!''

وہ بات تو بالکل درست کر رہا تھا۔ میں نے اس کے سمجھائے ہوئے پوائنٹ کو ذہن نشین کر لیا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے آفتاب! میں زبیر کو پوری طرح اپنے فوکس میں رکھوں گا۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ایک کام کرنا ہوگا...... بلکہ دو کام کرنا ہوں گے۔''

''جی کہیں۔'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔

''کام نمبر ایک تو یہ ہے کہ تم جس حد تک بھی ممکن ہو سکے، نہایت ہی محتاط انداز میں زبیر کے بارے میں معلومات اکٹھا کرو گے۔''

''ٹھیک ہے بیگ صاحب! یہ میں کر لوں گا۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔

''اور دوسرا کام یہ ہے کہ......'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم پہلی

فرصت میں گرین بیلٹ کے رہائشی اشفاق حسین سے ملاقات کرو گے اور اسے کسی وقت اپنے ساتھ لے کر میرے آفس آؤ گے۔''

''اشفاق حسین......'' اس نے خود کلامی کے انداز میں دہرایا، پھر مجھ سے پوچھا۔ ''اس شخص کا ہمارے کیس سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے؟''

''یہ وہ بندہ ہے، آفتاب!...... جس نے فائرنگ کی آواز سنی اور فوراً تھانے فون کیا۔ یہ الگ بات کہ پولیس والوں نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ مجھے امید ہے، اگر اس شخص سے میری بھرپور ملاقات ہو جائے تو کافی مفید معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، جناب! میں کوشش کرتا ہوں کہ کل ہی شام میں اشفاق حسین کو آپ کے پاس لے آؤں۔'' آفتاب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میں نے ضروری ہدایات کے ساتھ اسے رخصت کر دیا۔

آفتاب نے اس معاملے میں بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور اگلے ہی روز وہ اشفاق حسین کو پکڑ کر میرے پاس لے آیا۔ اشفاق حسین کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور متناسب جسم کا مالک ایک معقول صورت شخص تھا۔ سر کے بال کافی حد تک جھڑ چکے تھے۔ وہ ایک مخصوص کمیونٹی سے تعلق رکھتا تھا۔ گارڈن کے علاقے میں، کراچی چڑیا گھر کے قریب اس کا آٹو اسپیئر پارٹس کا بزنس تھا۔ اس کا شمار شریف النفس افراد میں ہوتا تھا۔

اشفاق حسین سے ہونے والی ملاقات خاصی بھرپور اور مفید ثابت ہوئی۔ اس سادہ مزاج شخص نے بعض ایسی پتے کی باتیں کیں، جو گوشی کے کیس میں گراں قدر اہمیت کی حامل ہوسکتی تھیں۔ ان امور کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں، مناسب مقامات پر کیا جائے گا۔

علاوہ ازیں آفتاب نے آنے والے دنوں میں استغاثہ کے گواہ زبیر کے بارے میں بھی مجھے بعض خاص الخاص معلومات فراہم کیں۔ میں نے اپنے ذہن میں اگلی پیشی کا ایک خاکہ سا بنا لیا اور مطمئن ہوگیا۔

آئندہ پیشی ایک ہفتے بعد کی تھی۔

●......●......●

اس پیشی پر پہلے استغاثہ کی جانب سے دو ایسے گواہوں کو پیش کیا گیا، جو گیٹ ہی پر رہتے تھے اور ملزم سے، کسی نہ کسی بنا پر ذاتی عناد رکھتے تھے۔ اس بات میں تو کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی، گوشی کوئی معقول آدمی نہیں تھا۔ پڑھائی کو وہ ترک کر چکا تھا اور کوئی کام دھندا نہیں کرتا تھا۔ دن بھر اِدھر اُدھر بیٹھنا اور آوارہ گھومنا اس کے معمول میں شامل تھا۔ ظاہر ہے، ایسے لوگوں کے دوست بھی کچھ اسی ٹائپ کے ہوتے ہیں اور اس قماش کے نوجوانوں کو عموماً محلے میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

ویسے آپ کی اطلاع کے لئے ایک دلچسپ بات بتاتا چلوں کہ جب میں جیل میں گوشی سے ملنے گیا تھا تو اپنی داستان سنانے کے بعد اس نے بھرّائی ہوئی آواز کے ساتھ، گہری سنجیدگی سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ موت اور زندگی کے اس کھیل میں باعزت بری ہو گیا تو خود کو بدل کر رکھ دے گا۔ پھر اس کے گھر اور محلے والوں کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔

جب وہ مجھ سے یہ وعدہ کر رہا تھا تو میں نے اس کی آنکھوں میں مضبوط عزم جھلکتا دیکھ لیا تھا۔ نوجوانی کا عزم بڑا طاقت ور اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند ہوتا ہے۔ مجھے قوی امید تھی کہ جیل سے رہا ہونے کے بعد وہ واقعی خود کو بدل ڈالے گا اور یہ بدلاؤ یقیناً مثبت ہو گا۔

میں نے اوپر استغاثہ کے جن دو گواہوں کا ذکر کیا ہے، ان کے بیانات اور بعد ازاں ان پر ہونے والی جرح میں کوئی خاص بات یا اہم نکتہ موجود نہیں تھا، لہٰذا میں کسی تفصیل میں پڑے بغیر آگے بڑھ جاتا ہوں۔

اگلی گواہی مقتول کے باپ صغیر احمد کباب فروش کی تھی۔ آج وہ کسی حد تک سنبھلا ہوا تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لئے کٹہرے کے پاس پہنچ گیا۔

"صغیر چاچا!" وہ بے حد اپنائیت سے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا، پھر اکیوزڈ باکس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ "کیا آپ اس لڑکے کو جانتے ہیں؟"

گواہ نے ایک نفرت انگیز نظر ملزم گوشی پر ڈالی اور دکھی لہجے میں بولا۔

"ہاں، جانتا ہوں۔ اس شیطان نے میرے ہنستے بستے گھر کو اُجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اگر میرا بس چلے تو میں........تو میں........"

وہ متذبذب انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوا تو وکیل استغاثہ نے جلدی سے پوچھا۔ "تو آپ کیا کرتے؟"

"تو میں........اُس مردود کے تکے بنا کر ان بلیوں کو کھلا دیتا، جو میری دکان کے باہر، گاہکوں کی میزوں کے نیچے گھات لگائے بیٹھی رہتی ہیں۔"

ان لمحات میں وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو من پسند انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"صغیر چاچا! ابھی آپ نے کہا ہے کہ اس شیطان نے آپ کے ہنستے بستے گھر کو اُجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس سے آپ کی مراد ستار کا قتل ہے یا پھر........؟"

وکیل استغاثہ نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑا تو گواہ نے خاصے غصیلے انداز میں جواب دیا۔ "جناب! میرا ستار تو بہت بعد میں جان سے گیا، اس کمینے نے تو بہت عرصے سے ہمارا جینا حرام کر رکھا تھا۔ ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اس کی اوچھی حرکتوں نے میری بیٹی کی زندگی میں زہر بھر دیا ہے۔ میں عدالت سے التجا کرتا ہوں، اس لڑکے کو ایسی عبرت ناک سزا دی جائے کہ آئندہ کسی آوارہ کو اس نوعیت کی کوشش کرنے کی ہمت نہ ہو۔"

وکیل استغاثہ نے اسی قسم کے مزید چند سوالات کئے اور جرح کے سلسلے کو موقوف کر دیا۔ میں نے اپنی باری پر جج سے جرح کی اجازت حاصل کی اور وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے صغیر احمد کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔

"صغیر صاحب! مجھے آپ کے بیٹے ستار کی اندوہ ناک موت کا دلی افسوس ہے۔ میں اس دکھ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ لیکن پیشے کے اعتبار سے میری چند مجبوریاں ہیں، جنہیں بہر صورت مجھے پورا کرنا ہو گا۔ اگر میری کوئی بات آپ کو سخت یا ناگوار لگے تو پیشگی معذرت چاہوں گا۔"

"آپ اگرچہ مخالف پارٹی کے وکیل ہیں اور میرے بیٹے کے قاتل کو رہا کرانے

کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ان ہمدردانہ جملوں کے لئے میں آپ کا شکرگزار ہوں۔"

صغیر احمد نے بوجھل آواز میں کہا۔ "آپ اپنا پیشہ ورانہ فرض ضرور پورا کریں۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور استغاثہ کے گواہ سے سوال کیا۔

"صغیر صاحب! وکیل استغاثہ کے اشارے پر آپ نے تھوڑی دیر پہلے بڑی نفرت سے میرے مؤکل کو شیطان، مردود اور کمینہ ایسے القابات سے نوازا ہے اور کہا ہے کہ اگر آپ کے اختیار میں ہوتا تو آپ اُس کی تکا بوٹی کر کے آوارہ بلیوں کو کھلا دیتے۔ علاوہ ازیں آپ کو یہ دعویٰ بھی ہے کہ اسی شخص نے آپ کے ہنستے بستے گھر کو اُجاڑ ڈالا ہے۔ میں صرف آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ ملزم کو جب سے جانتے ہیں؟"

"جب سے یہ پیدا ہوا ہے۔" وہ بڑے وثوق سے بولا۔ "اس علاقے کے تمام بچے میری آنکھوں کے سامنے پل بڑھ کر جوان ہوئے ہیں۔ اس کا باپ، اللہ بخشے...... بڑا ہی نیک اور بھلا آدمی تھا۔ محلے میں کسی کو اس شخص سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اللہ نے اسے اپنی اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب نہیں کیں۔ اب یہ دونوں بھائی چھوٹے ہی تھے کہ اللہ نے جہانگیر شاہ کو اپنے پاس بلا لیا۔"

"اس کا مطلب ہے، ملزم کے باپ جہانگیر شاہ سے آپ کو کبھی کوئی شکایت نہیں رہی تھی؟" میں نے اِدھر اُدھر کے سوالات کی مدد سے اسے ایک مخصوص راہ پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ "بالکل نہیں جناب! وہ بہت ہی عظیم انسان تھا۔"

"اور اس کی بیوہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"سائرہ بی بی نے شوہر کی موت کے بعد جس طرح محنت کر کے دونوں بیٹوں کو پالا پوسا اور تعلیم دلوا کر پروان چڑھایا ہے، اس کی مثال بہت کم دیکھنے اور سننے کو ملتی ہے۔" صغیر احمد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "یہ اپنے شوہر سے بھی زیادہ عظیم عورت ہے۔"

میں نے مخصوص انداز کی جرح کو دھیرے دھیرے آگے بڑھاتے ہوئے استفسار کیا۔

"صغیر صاحب! جہانگیر شاہ مرحوم کا بڑا بیٹا آفتاب بھی زندگی کے ہر مرحلے پر

آپ کی نظروں کے سامنے رہا ہے اور نظروں کے سامنے ہے۔ اس نے مناسب تعلیم حاصل کر کے نوکری شروع کی اور پھر شادی بھی کر ڈالی۔ محمود آباد والوں کو یا آپ کو کبھی اس سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو بتائیں؟"

"بالکل نہیں، وکیل صاحب!" وہ قطعی لہجے میں بولا۔ "بلکہ چند ماہ پہلے کسی غلط فہمی کی بنا پر ستار کے دوستوں نے اسے زدوکوب کیا تھا تو مجھے اس واقعے کا دلی افسوس ہوا تھا...... بعد میں وہ کوئی اور معاملہ نکل آیا تھا۔"

"اس فیملی کا صرف ایک فرد بچا ہے اور وہ ہے...... ملزم نصیر عرف گوشی!" میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "اب میں اس کی طرف آتا ہوں۔"

وہ ہمہ تن گوش ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"صغیر صاحب! اچھی طرح سوچ کر بتائیں، چند ماہ پہلے جب آپ کو اور آپ کے بیٹے ستار کو اے ایس آئی سرفراز شاہ پکڑ کر اپنے ساتھ تھانے لے گیا تھا تو کیا اس سے پیشتر آپ کو کسی بھی حوالے سے ملزم سے کوئی شکوہ شکایت تھی؟"

"جی نہیں...... بالکل نہیں۔" وہ پوری قطعیت سے بولا۔

"یعنی اس رات پہلی مرتبہ آپ کو پتہ چلا کہ اندر ہی اندر کیا کھچڑی پک رہی تھی۔" میں نے گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔ "ابتدا میں تو میں اس بات پر ستار سے سخت ناخوش تھا کہ اس نے اپنے دوستوں کی مدد سے آفتاب پر چڑھائی کر کے غنڈا گردی کیوں کی، لیکن جب مجھے یہ پتہ چلا کہ اس خرابے کی جڑ کیا ہے تو مجھے ملزم کی حرکات پر دلی رنج ہوا۔ میں نے اسے برا بھلا بھی کہا، مگر......" وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"مگر...... اس کے باوجود بھی میں اس سب کچھ کے حق میں نہیں تھا، جو اس روز بے چارے آفتاب کے ساتھ پیش آیا تھا۔"

"کوئی بھی معقول انسان اس واقعے کی حمایت نہیں کر سکتا، صغیر صاحب!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا، پھر پوچھا۔ "اس واقعے کے بعد دونوں

پارٹیوں میں راضی نامہ ہو گیا تھا۔ کیا اس کے بعد بھی ملزم کبھی آپ کی گلی میں منڈلاتا پایا گیا تھا؟''

''نہیں جناب! پھر ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اگر ایسا کچھ ہوتا تو فوراً مجھے خبر ہو جاتی۔ کیونکہ ایسی صورت میں ستار خاموش نہیں بیٹھا رہتا اور کوئی بڑا تنازع کھڑا ہونے کے امکانات تھے۔''

''جیسا کہ پہلے ہوا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''آفتاب سے مار پیٹ والے واقعے کے بعد ہی آپ کے علم میں یہ آیا تھا کہ ملزم کس نوعیت کی حرکات میں ملوث تھا۔ ہے نا؟''

''جی......جی!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔

''صغیر صاحب! تھوڑی دیر پہلے آپ نے وکیل استغاثہ کی جرح کے جواب میں معزز عدالت کے روبرو یہ بیان فرمایا ہے......میرا ستار تو بعد میں جان سے گیا، اس کمینے نے تو بہت عرصے سے ہمارا جینا حرام کر رکھا تھا۔ ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اس کی اوچھی حرکتوں نے میری بیٹی کی زندگی میں زہر بھر دیا ہے.....وغیرہ وغیرہ!''

میں لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس کے ساتھ ہی آپ نے بڑے غضب ناک انداز میں معزز عدالت سے استدعا کی ہے کہ ملزم کو کوئی عبرت ناک سزا سنائی جائے۔ میں کچھ غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں جناب!'' وہ رسانیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں نے ایسا ہی کہا تھا۔''

''اگر آپ نے ایسا ہی کہا تھا اور یہی حقیقت ہے تو پھر آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

وہ حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے جناب؟''

''جھوٹ یہ بولا ہے، صغیر چاچا!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے جو بیان دیا ہے، اس سے واضح تاثر یہی اُبھرتا ہے کہ آفتاب سے ہونے والی مار پیٹ کے واقعے سے پہلے آپ کو ملزم سے کسی قسم کی شکایت

نہیں تھی۔ یہ شکایت پیدا ہوئی اور اسی وقت متعلقہ تھانے نے صلح صفائی کرا کے آپ کی شکایت دُور کر دی۔ اس دن سے اب تک ملزم نے آپ کی گلی میں قدم نہیں رکھا، یعنی آپ کو شکایت کا موقع نہیں دیا لیکن......''

میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپ کے یہ الفاظ کہ......میرا ستار تو بعد میں جان سے گیا، اس کمینے نے تو بہت عرصے سے ہمارا جینا حرام کر رکھا تھا......ظاہر کرتے ہیں کہ مقتول کی موت سے پہلے، کافی عرصے سے ملزم آپ کو تنگ کرتا چلا آ رہا تھا۔ گویا اس نے آپ کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔''

میں نے ایک مرتبہ پھر توقف کیا اور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''یہ دونوں بیانات ایک دوسرے کی ضد ہیں، جیسا کہ وکیل استغاثہ اور وکیل صفائی ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔ اب آپ ہی وضاحت کریں کہ آپ نے کس وکیل کے سامنے سچ بولا ہے اور کس کے آگے غلط بیانی کی ہے؟''

''وکیل استغاثہ نے مجھے جو بیان دینے کو کہا تھا، میں نے ان کے سامنے وہی سب کہا ہے۔ جب کہ......'' وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا اور پریشان نظروں سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''جبکہ حقیقت وہی ہے، جو آپ نے میرے سامنے بیان کی ہے؟''

وہ کوئی جواب دینے کے بجائے متذبذب نظروں سے کبھی جج اور کبھی وکیل استغاثہ کو تکنے لگا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''چلو کوئی بات نہیں، صغیر چاچا! میں آپ کو یہ بتلانے پر مجبور نہیں کروں گا کہ وکیل استغاثہ نے آپ کو کوئی خاص الخاص پٹی پڑھائی تھی، بس آپ صرف اس بات کی تصدیق کر دیں کہ آپ نے مجھ سے کوئی دروغ گوئی نہیں کی۔''

اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''وکیل صاحب! میں نے آپ سے قطعاً کوئی جھوٹ نہیں بولا۔''

میں نے فاتحانہ نظروں سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔ وہ خاصا کھسیانا سا

دکھائی دیا۔ اس کیس کے حوالے سے ایک اہم زاویہ میں معزز عدالت کے علم میں لانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور یہ ایک طرح سے میری جزوی جیت تھی۔ میں دوبارہ گواہ کی طرف متوجہ ہوا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”صغیر چاچا! بس آپ سے ایک آخری سوال۔“

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔

”کیا آپ کے بیٹے کی کسی سیاسی پارٹی سے بھی وابستگی تھی؟“

”باقاعدہ وابستگی تو نہیں تھی، جناب!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن اس کے بہت ہی قریبی دوست ایک سیاسی پارٹی کے رکن اور سرگرم کارکن رہے ہیں۔“

”مقتول کے دوستوں سے آپ کی مراد فدا حسین، نوازش علی، محمد رفیق اور زبیر وغیرہ ہی ہے نا؟“ میں نے سنسنی خیز لہجے میں دریافت کیا۔

”میں نے ابھی جس سیاسی پارٹی کا ذکر کیا ہے، زبیر کا اس سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ لڑکا اس پارٹی کی مخالف پارٹی سے وابستہ ہے۔“ صغیر احمد نے بڑے واضح الفاظ میں بتایا۔ ”ستار کے دوستوں سے میری مراد صرف فدا حسین، نوازش علی اور محمد رفیق ہی تھی۔“

”آپ کا کیا خیال ہے، صغیر چاچا......!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ بات بڑی عجیب سی محسوس نہیں ہوتی کہ آپ کا بیٹا، وقوعہ کی رات ایک ایسے لڑکے کے ساتھ گرین بیلٹ کے علاقے میں موجود تھا، جو اس کے دوستوں کا دشمن تھا، نظریاتی اور سیاسی بنیادوں پر؟“

”ہاں...... واقعی، یہ تو بڑی عجیب اور حیران کن بات ہے۔“ صغیر احمد نے متذبذب انداز میں آنکھیں پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

●......●......●

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں استغاثہ کا سب سے اہم گواہ

زبیر علی کھڑا تھا۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا مالک ایک پستہ قامت نوجوان تھا۔ رنگت گوری، چہرہ گول اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی۔ زبیر کی عمر بس اُنیس بیس ہی تھی۔ اس نے ہلکی ہلکی مونچھیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ زبیر کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا تھا، جن کی بہت جلد مونچھ داڑھی نکل آتی ہے۔ زبیر خاصا کھویا کھویا دکھائی دیتا تھا۔

اس نے اپنا مختصر سا بیانِ حلفی ریکارڈ کرایا، پھر وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے مختلف زاویوں سے گھما پھرا کر گواہ سے درجن بھر سوالات کئے، جن کا لب لباب یہ تھا کہ وقوعہ کی رات اس نے اپنی آنکھوں سے ملزم اور مقتول کو نیم تاریکی میں کھڑے ہو کر باتیں کرتے دیکھا تھا۔ پھر دو فائر ہوئے اور مقتول زمیں بوس ہو گیا۔ بعد ازاں ملزم ایک گلی میں غائب ہو گیا۔

وکیلِ استغاثہ نے گواہ کو فارغ کیا تو میں جرح کے لئے اس کے پاس پہنچ گیا۔

”زبیر علی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟“

ابتدا میں میرا انداز بڑا نرم اور دوستانہ تھا۔ دراصل، میں اسے مکھن لگا کر بڑی صفائی اور سہولت سے گھسنا چاہتا تھا، تاکہ اسے یہی محسوس ہو کہ وہ گھس نہیں رہا، بلکہ پھسل رہا ہے۔ اور جب میں اپنا کام نکال کر فارغ ہو جاؤں، تب اسے احساس ہو کہ انجانے میں کون کون سا حصہ چھل کر جلن زدہ ہو چکا ہے!

اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”میں صرف مڈل تک پڑھ سکا ہوں۔“

”اب کوئی کام وغیرہ کرتے ہو یا یونہی گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہو؟“

”میں ایک بسکٹ فیکٹری میں کام کرتا ہوں، جناب!“

”یہ بسکٹ فیکٹری کہاں پر واقع ہے؟“

”کورنگی انڈسٹریل ایریا میں۔“

”کیا تم آئی وٹنس کا مطلب جانتے ہو؟“ میں نے اچانک پٹری بدل دی۔

”جی نہیں۔“ اس نے تامل کرتے ہوئے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''آئی وٹنس سے میری مراد ہے عینی شاہد........ یعنی ایسا گواہ جس نے اپنی آنکھوں سے کوئی واقعہ ظہور پذیر ہوتے دیکھا ہو........ جیسا کہ تم نے وقوعہ کی رات ملزم اور مقتول کو گرین بیلٹ کے علاقے میں پُلیا کے نزدیک کھڑے ہو کر باتیں کرتے دیکھا تھا۔تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی جی، سمجھ رہا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا۔''میں کوئی بے وقوف آدمی نہیں ہوں۔''

''ویری گڈ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔''تو گویا تم اس کیس میں ایک لحاظ سے آئی وٹنس یعنی عینی شاہد بھی ہو۔کیا تمہیں معلوم ہے،عینی شاہد کی گواہی کتنی اہم ہوتی ہے؟''

''جی، مجھے سب پتہ ہے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔''عینی شاہد کی گواہ پر ملزم کو سزائے موت ہو جایا کرتی ہے۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے حقارت بھری نظروں سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے میرے مؤکل کی طرف دیکھا۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔''اگر یہ ثابت ہو جائے کہ عینی شاہد نے غلط بیانی سے کام لیا ہے تو ملزم کے بجائے اسے پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے!

''جی........ یہ تو میں نے کہیں نہیں سنا۔'' وہ ایک دم بے حد خوف زدہ نظر آنے لگا۔''جھوٹی گواہی کی ایک مختصر سی سزا تو ہوتی ہے،لیکن پھانسی کے بارے میں آج پہلی مرتبہ آپ کی زبان سے سن رہا ہوں۔''

''تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، زبیر!'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔۔

''تم ایک پکے اور سچے عینی شاہد ہو۔تم نے ابھی تک کوئی جھوٹ نہیں بولا ہے اور نہ ہی آئندہ دروغ گوئی کا ارادہ رکھتے ہو........ ہے نا؟''

''جی ہاں، جی ہاں۔'' اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

''زبیر! مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہاری ایک سیاسی پارٹی سے بڑی گہری دلچسپی اور

وابستگی ہے۔لیکن افسوس کہ اس الیکشن میں تمہاری پارٹی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے!''

''بس جی........ ہار جیت تو ہر کھیل کا حصہ ہوتا ہے۔'' وہ اُداس سے لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔

''کیا تمہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ پارٹی کے ساتھ ہی تم بھی ہار گئے ہو؟''

''نہیں جی، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''مقتول سے تمہاری دوستی کتنی پرانی تھی؟'' میرے سوالات میں ایک دم تیزی آ گئی۔

''ہماری دوستی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔''بس ایک دو ماہ سمجھ لیں یا پھر تین چار ماہ........ ہماری دوستی الیکشن کمپین کے دوران ہی میں ہوئی تھی۔''

''کیا تمہیں یہ بات معلوم تھی کہ مقتول کا تعلق ایک ایسی پارٹی سے تھا، جو تمہاری سیاسی پارٹی کی شدید مخالف تھی؟'' میں نے قدرے سخت انداز میں استفسار کیا۔

''جی۔'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔''مجھے اس حقیقت کا علم تھا۔''

''اس کے باوجود بھی تم دونوں میں دوستی ہو گئی۔'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔''کہیں ایسا تو نہیں کہ مقتول کو تمہاری سیاسی وابستگی کا علم نہ ہو؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔''وہ بھی میری سیاسی وابستگی سے اچھی طرح واقف تھا۔''

''پھر........ پھر بھی........'' میں نے اصراری انداز میں کہا۔''یہ بہت عجیب سا نہیں ہے؟''

''کوئی عجیب نہیں ہے۔'' وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔''دو ایسے خاندان، جن میں نسل در نسل دشمنی چلی آ رہی ہو، ان کی اولادوں میں بعض اوقات لڑکا اور لڑکی اپنے اپنے خاندان کی مخالفت مول لے کر بھی شادی کر لیتے ہیں۔آپ نے بھی ایسی مثالیں سنی ہوں گی؟''

''سنی بھی ہیں اور دیکھی بھی ہیں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور جرح کی

گاڑی کو ایک نئی پٹڑی پر ڈال دیا۔

''زبیر علی! کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ کی رات تم اور مقتول گرین بیلٹ کے علاقے میں نالے کے قریب موجود تھے۔ پھر ملزم بھی وہاں چلا آیا........ اس نے خواہش ظاہر کی کہ وہ مقتول سے تنہائی میں دو باتیں کرنا چاہتا ہے۔ پھر ملزم اور مقتول نالے کی پُلیا کے قریب نیم تاریک مقام پر چلے گئے؟''

''جی ہاں، میں نے یہی بیان دیا ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''آپ تو میری تائید کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔

''جب وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے تو تم تھوڑے فاصلے پر موجود تھے۔ تم نے ملزم کو مقتول پر دو گولیاں چلاتے دیکھا، مقتول گولیاں کھا کر منہ کے بل زمیں بوس ہو گیا اور ملزم نے ایک قریبی گلی میں راہِ فرار اختیار کر لی۔ سب کچھ ایسا ہی ہوا تھا نا......؟''

''جی، ہوا تو ایسے ہی تھا، لیکن........'' وہ خاصا اُلجھن میں دکھائی دیتا تھا۔

میں نے قدرے درشت لہجے میں استفسار کیا۔ ''لیکن کیا؟''

''وہ دراصل بات یہ ہے کہ........'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جب وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے تو میرا دھیان دوسری طرف ہو گیا تھا۔ پھر جب فائرنگ کی آواز سنائی دی تو میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ اس اثنا میں مقتول گولیاں کھا کر زمین پر گر چکا تھا۔ میں جلدی سے بھاگ کر مقتول کے پاس پہنچا۔ اس دوران ملزم قریبی گلی میں غائب ہو چکا تھا۔''

بات ختم کر کے وہ اُلجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تو گویا تم اصلی آئی وٹنس نہیں؟''

''جو حقیقت تھی، وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے۔'' وہ کمزور آواز میں بولا۔

''یہ بیان تم نے اس لئے تو نہیں بدلا کہ آئی وٹنس کے جھوٹا ثابت ہونے پر اُسے پھانسی کی سزا ہو جاتی ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم سچے ہو تو پھر پریشانی کیسی؟''

وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ ''میں پریشان تو نہیں ہوں۔''

''تم پریشان ہی نہیں، بلکہ بہت زیادہ گھبراہٹ کا بھی شکار ہو۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میرا اعتبار نہیں ہے تو کسی اور سے پوچھ لو؟''

وہ ہراساں نظروں سے عدالت میں موجود ایک ایک شخص کا چہرہ دیکھنے لگا۔ میں نے با آوازِ بلند کہا۔

''ان لوگوں کو دیکھنے سے تمہارا مسئلہ حل نہیں ہو گا، زبیر! میں تھوڑی دیر بعد تمہارے سامنے ایک ایسا چہرہ لاؤں گا، جو تمہارے جھوٹ کی ایک ایک پرت کھول کر معزز عدالت کے سامنے پیش کرے گا۔''

''کک........کون........؟'' وہ لکنت زدہ آواز میں بولا۔ ''کون ہے وہ؟''

''تھوڑا صبر۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم اچھی طرح سوچ سمجھ کر پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو۔ اگر تم نے سچ بولا تو ٹھیک، وگرنہ دوسری صورت میں وہ شخص ضرور تمہارے سامنے لایا جائے گا۔ فی الحال اتنا جان لو کہ وہ صفائی کا ایک گواہ ہے........ ایک دم سچا اور سولڈ آئی وٹنس!''

میرے انداز نے عدالت کے کمرے میں ایک سنسنی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ انکوائری آفیسر، وکیلِ استغاثہ، حاضرینِ عدالت کے ساتھ ساتھ جج بھی اسی سنسنی کی لپیٹ میں نظر آتا تھا۔ وہ بولے بغیر رہ نہ سکا۔

''بیگ صاحب! آپ کس آئی وٹنس کا تذکرہ کر رہے ہیں؟''

''جنابِ عالی!'' میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''میرا متذکرہ شخص وہی ہے، جس نے سب سے پہلے تھانے فون کر کے اس واردات کی اطلاع دی تھی۔ لیکن پولیس والوں نے اسے معمول کی فائرنگ سمجھتے ہوئے اطلاع کنندہ کی بات پر دھیان دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جنابِ عالی! میں گرین بیلٹ کے ایک رہائشی مسٹر اشفاق حسین کا ذکر کر رہا ہوں۔''

''تو اشفاق حسین اس کیس میں آئی وٹنس کی حیثیت رکھتا ہے؟'' جج نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔

''یس، یور آنر!'' میں نے گردن کو تعظیمی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''اشفاق حسین

اصلی آئی وٹنس ہے۔ ایک چھوٹے سے ٹرائل کے بعد میں اسے عدالت میں پیش کروں گا...... اگر استغاثہ کا معزز گواہ اس کی نوبت آنے دے گا تو۔"

بات کے اختتام پر میں نے تیکھی نظروں سے زبیر علی کو گھورا۔

جج نے مجھ سے پوچھا۔

"بیگ صاحب! کیا اشفاق حسین اس وقت آسانی سے مہیا ہے؟"

"بالکل جناب!...... وہ باہر برآمدے میں موجود ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اوکے۔" جج نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔"

میں دوبارہ استغاثہ کے گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ حیران و پریشان کھڑا میری ہی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ اس کے اندر کھلبلی مچی ہوئی ہے اور اس کھلبلی نے اسے ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا کر رکھا تھا۔

"زبیر علی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ "وقوعہ کی رات، اشفاق حسین اپنے بنگلے کی چھت پر موجود تھا۔ وہ ٹی وی انٹینا کو ٹھیک کرنے اوپر چڑھا تھا۔ اس کام میں اسے لگ بھگ پندرہ منٹ لگ گئے۔ جیسے وہ واپس جانے لگا تو نالے کی جانب اس کی نگاہ اُٹھ گئی، جہاں سروس روڈ کے کنارے دو لڑکے کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ظاہر ہے، ان کی آواز تو اشفاق حسین تک نہیں پہنچ رہی تھی، لیکن اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں ان کے قد کاٹھ اور جسامت کا بہ خوبی اندازہ لگا سکتا تھا۔ ان میں ایک دُبلا پتلا اور دراز قامت تھا، جب کہ دوسرا چھوٹے قد کا مالک ایک گول مٹول لڑکا تھا۔ میرا خیال ہے، تم بہ خوبی سمجھ رہے ہو، وہ دونوں لڑکے کون تھے؟"

"ایک تو میں تھا اور دوسرا ستار۔" زبیر نے جلدی سے تصدیق کر دی۔ "ستار دُبلا پتلا اور لمبے قد کا تھا۔ ہم وہاں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ یہ تو میں نے آپ کو بھی بتایا تھا۔"

"ہاں، ہاں یہاں تک تو بالکل ٹھیک بتایا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے بعد تم نے کہانی میں ایک کردار کو داخل کیا تھا، یعنی میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم نصیر عرف گوشی کو۔ جبکہ وہ وہاں گیا ہی نہیں تھا۔"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں...... میرا مطلب ہے، اشفاق حسین غلط کہہ رہا ہے۔" وہ گھبراہٹ آمیز انداز میں بولا۔ "تھوڑی ہی دیر کے بعد ملزم وہاں آیا تھا اور اس نے....."

"یہ کہانی اب مزید چلنے والی نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تم خوامخواہ اشفاق حسین پر جھوٹ بولنے کا الزام لگا رہے ہو، حالانکہ اس نے ابھی تک عدالت میں آ کر ایک لفظ بھی نہیں کہا؟"

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"بیگ صاحب! آپ ٹرائل جاری رکھیں۔"

میں نے زبیر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوسکتا ہے، اشفاق حسین ان دو لڑکوں کو محوِ گفتگو دیکھ کر چھت سے نیچے اُتر آیا، لیکن انہوں نے پُراسرار انداز میں نالے کی پُلیا کی سمت پیش قدمی کی تو وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی چھٹی حِس نے اطلاع دی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ وہ چھت پر ہی موجود رہ کر انہیں دیکھنے لگا......"

"آپ کا بندہ بالکل غلط کہہ رہا ہے، وکیل صاحب!" زبیر نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔ پھر اضافہ کیا۔ "میں تو ادھر ہی کھڑا تھا۔ مقتول اور ملزم پُلیا کی سمت۔"

"میں نے کہا نا، اس کہانی میں تیسرے کردار کی کوئی گنجائش نہیں۔" میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی درشت لہجے میں کہا۔ "پہلے مجھے بات پوری کرنے دو، پھر تم وضاحتی بیان دینا۔"

وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی حالت سے بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو چکی ہے۔ میں نے پہلے سے بھی جارحانہ لہجے میں کہا۔

"جب اشفاق حسین نے ان دونوں کو مشکوک انداز میں نیم تاریکی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو فطری جذبے کے تحت اس کے اندر تجسس بھڑک اٹھا۔ وہ وہیں چھت پر کھڑے ہو کر ان کی سرگرمی کو دیکھنے لگا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ایک ایسا خوف ناک منظر دیکھا کہ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں......"

میں نے ڈرامائی انداز میں لمحاتی توقف کیا، پھر سنسنی خیز لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اشفاق حسین نے دیکھا کہ پستہ قامت لڑکے نے اپنے لباس میں سے ایک گن برآمد کی اور دراز قامت لڑکے کے سینے پر دو فائر کر دیئے۔ لمبا لڑکا اسی لمحے زمین پر گر گیا۔ پستہ قد نے گن کو نالے میں پھینکا اور........“

”گن کو میں نے نالے میں نہیں پھینکا تھا، بلکہ........“

”بلکہ........ جینز کی جیب میں ٹھونس کر تنگ گلی سے فرار ہو گئے تھے!“ میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ ”ہے نا؟“

میرے نفسیاتی ”ٹریٹ منٹ“ نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا اور اسی بوکھلاہٹ میں اسے اپنی زبان پر اختیار نہیں رہا تھا اور بے ساختہ اُس نے سچ اُگل دیا تھا۔ لیکن فوراً ہی اسے اس خطرناک حقیقت کا ادراک ہو گیا کہ نادانستگی میں اس نے اپنی قبر کے لئے جگہ بک کروالی تھی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا؟ کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کبھی واپس نہیں ہوتے! میں نے جان بوجھ کر گن کو پھینکنے کے حوالے سے گندے نالے کا ذکر کیا تھا اور اسی پوائنٹ پر وہ مار کھا گیا تھا۔ اگر وہ خاموش رہتا تو شاید اس کی زبان کھلوانے کے لئے مجھے اور محنت کرنا پڑتی۔ بہرحال، یہ کیس ہمارے حق میں پلٹ چکا تھا۔

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

”گن کو جیب میں رکھنے یا........ نالے میں پھینکنے کا کیا سوال؟........ میں تو اُدھر دُور سروس روڈ پر کھڑا نہیں........ دیکھ رہا تھا اور........“

”اور........ اشفاق حسین اپنے گھر کی چھت پر کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ تم نے ستار کو قتل کرنے کے بعد گن کو جینز کی جیب میں رکھا اور جائے وقوعہ سے فرار ہو گئے۔ اشفاق حسین آناً فاناً میں گھر کے اندرونی حصے میں پہنچا اور پولیس اسٹیشن فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دے دی۔ لیکن افسوس کہ........!“

میں نے جملہ نامکمل چھوڑا، کندھے اچکائے اور خاموش ہو گیا۔

جج نے کہا۔

”بیگ صاحب! آپ نے ابھی اس واقعے کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، اس کی تصدیق کے لئے گواہ اشفاق حسین کو پیش کریں۔“

اگلے ہی لمحے عدالتی ضوابط کے مطابق، اشفاق حسین کو عدالت کے کمرے میں لایا گیا اور صفائی کے گواہ کی حیثیت سے اس نے معزز عدالت کے سامنے میرے بیان کی تصدیق کر دی۔ اشفاق حسین نے زبیر علی کو دیکھا تو فوراً پہچان گیا۔

میں نے روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

”جنابِ عالی! جیسا کہ بھری عدالت میں استغاثہ کے گواہ زبیر علی نے اپنی زبان سے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اس نے گن کو نالے میں نہیں پھینکا تھا، جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ صفائی کے گواہ کے مطابق، اس نے مذکورہ گن کو اپنی جینز کی جیب میں ڈالا تھا۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مقتول ستار کا قتل نصیر عرف گوشی نے نہیں، بلکہ زبیر علی نے کیا تھا۔ میرے مؤکل کو محض قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی گئی ہے، لہٰذا........“

میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”لہٰذا، معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ وہ استغاثہ کے گواہ زبیر علی کو شاملِ تفتیش کرنے کے احکام جاری کرے۔ اس کے ساتھ ہی میں پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ میرے مؤکل کی بے گناہی کو تسلیم کرتے ہوئے اسے باعزت بری کر دیا جائے۔ دیٹس آل یور آنر!“

جج نے اس پیشی پر تو گوشی کو رہا کرنے کا حکم نہیں دیا، البتہ متعلقہ عدالتی عملے اور انکوائری آفیسر کو ہدایت کی کہ وہ گواہ زبیر کو شاملِ تفتیش کر کے حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کریں۔

آئندہ پیشی کے لئے جج نے سات روز بعد کی تاریخ دے دی۔

●......●......●

جب کسی خاص ریفرنس کے ساتھ کوئی شخص پولیس کے ہتھے چڑھتا ہے تو پھر پولیس کی کارکردگی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ اور خاص طور پر اس صورت میں کہ پولیس نے اپنی ہزیمت یا خفت کا حساب بھی چکتا کرنا ہو!

گزشتہ پیشی پر استغاثہ کے گواہ زبیر علی کی زبان سے بے ساختہ جس طرح یہ الفاظ خارج ہوئے تھے کہ اس نے آلۂ قتل کو گندے نالے میں نہیں پھینکا........اس سفاک حقیقت نے پولیس کو بھی چوکنا کر دیا تھا۔ چنانچہ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں خاطرداری کے ذریعے پولیس نے اس کی زبان مکمل طور پر کھلوالی، اور اس کی کسٹڈی سے وہ پسٹل بھی برآمد کرالیا، جس سے ستار کو قتل کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اقبالِ جرم بھی کرلیا تھا۔

یہ ایک خالصتاً سیاسی قتل تھا۔ ستار کا جن لوگوں کے ساتھ یارانہ تھا، انہوں نے مخالف دھڑے کے چند افراد کو بڑی ہزیمت پہنچائی تھی اور اس معرکے میں ستار نے بھی رفیق، نوازش اور فدا کا ساتھ دیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے زبیر کے ذریعے اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لئے آغاز ستار سے کیا تھا۔ لیکن یہ کہانی اپنے بدترین انجام کو نہ پہنچ سکی۔ کیونکہ الیکشن میں زبیر کی سیاسی پارٹی کو بری طرح شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا، لہٰذا ان کی طاقت پھُس ہوکر رہ گئی تھی۔

زبیر نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ستار کو اپنا دوست بنایا اور کچھ اس انداز میں منصوبہ ترتیب دیا کہ الزام گوشی پر جائے۔ وہ گوشی اور ستار کے درمیان ہونے والی بدمزگی سے واقف تھا۔ ستار کو قتل کرنے کے بعد وہ سیدھا تھانے پہنچا اور گوشی کے حوالے سے ایک من گھڑت کہانی سنادی۔

پولیس کی کوتاہی کے باعث اس کیس نے ایک بالکل نئی شکل اختیار کرلی تھی۔ اگر پولیس اشفاق حسین کے بیان کو اہمیت دیتی اور اس کا مکمل بیان لیتی تو شروع ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی کہ ملزم گوشی بے گناہ اور بے قصور ہے۔ لیکن قدرت کے ہر کام میں مصلحت چھپی ہوتی ہے۔

اگر گوشی آسانی سے چھوٹ جاتا تو شاید وہ سچی توبہ نہ کرتا۔ قدرت جب کسی شخص کو راہِ راست پر لانا چاہتی ہے تو وہ اسی طرح کے بہانے ڈھونڈ لیا کرتی ہے!

●.....●.....●

مثالی جوڑا

کہتے ہیں، جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ آسمانوں پر بننے والے جوڑوں میں سے اکثر زمین پر بگڑ جاتے ہیں۔ کیونکہ زندگی بننے اور بگڑنے کے عمل سے عبارت ہے اور کوئی بھی انسان زندگی کی اس کہانی کا کردار بنے بنا رہ نہیں سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی بن کر اور کوئی بگڑ کر اپنا کردار نبھاتا ہے۔"

وہ بھی ایک ایسا ہی جوڑا تھا، جو یقیناً........آسمانوں پر ہی بنا تھا۔ لیکن نیرنگیِ وقت اور حوادثِ زندگی اسے بگاڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ منفی اور مخالف قوتوں نے چہرے بدل بدل کر ان پر حملے کئے، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ہر مصیبت اور مشکل کو انہوں نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور اپنے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ وہ زندگی کے آخری ادوار میں اگرچہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے، لیکن ان کی اکائی سلامت نظر آتی تھی اور........اس سلامتی کا سبب تھا، محبت........!

وہ دونوں ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے تھے۔

جب پہلی مرتبہ میں ان سے ملا، وہ آزمائش کی کڑی ساعتوں سے گزر رہے تھے۔ میں نے "ان سے ملا" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس سے میری مراد دراصل، ان میں سے ایک سے ملاقات ہے۔ دوسرے فریق سے ملنا تو ممکن نہیں تھا، کیونکہ وہ سخت نوعیت کی میڈیکل ٹریٹمنٹ پر تھی۔ صرف شوہر کو اس کے پاس جانے کی اجازت تھی اور وہ بھی، مخصوص نوعیت کی احتیاطی تدابیر کے بعد۔ یا پھر وہ ڈاکٹر اس کے قریب جا سکتا

تھا، جو اس کا علاج کر رہا تھا۔ میری نظر میں وہ ایک مثالی جوڑا تھا۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

وہ ماہِ اپریل کی کوئی تاریخ تھی۔ موسم سہانا اور دن خوش گوار تھا۔ میں معمول کے مطابق، اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص مجھ سے ملنے کے لئے آیا۔ اپنی باری پر وہ میرے چیمبر میں داخل ہوا تو میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔

اس نے مجھے سلام کیا، میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور وہ میرے بااخلاق اشارے پر ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی فرمایئے........ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا اور متذبذب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ ذہنی طور پر بری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے بہت کچھ کہنے آیا تھا، لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کہاں سے شروع کرے۔ میں اس سے کچھ پوچھے بغیر، بہ غور اس کا جائزہ لینے لگا۔

اس کی عمر لگ بھگ ساٹھ سال رہی ہوگی۔ رنگت سانولی، قد درمیانہ اور جسم متناسب، اس کے سر کے بال سامنے سے اُڑ چکے تھے اور جو باقی بچے تھے، وہ گرے وہائٹ ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت اور شرافت ٹپکتی تھی۔ تاہم اس کے ساتھ ہی گہری فکرمندی اور پریشانی کا تاثر بھی اُبھرتا تھا۔ وہ ایک معقول صورت اور کلین شیو شخص تھا۔ اس نے سفید کاٹن کا شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ مجموعی طور پر وہ متاثر کُن شخصیت کا مالک تھا۔

”میرا نام کریم ہے........ کریم بھائی۔“ مجھے مسلسل اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر اس نے تعارف کرانے والے انداز میں کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اپنا پرابلم کس طرح آپ کے سامنے بیان کروں؟“

”کس طرح........ کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”اور بے دھڑک شروع ہو جائیں........ باقی کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔“

ان کے چہرے پر قدرے اطمینان نظر آنے لگا، ٹھہرے ہوئے انداز میں بولے۔

”وکیل صاحب! آپ کے پاس تو رنگ رنگ کے کلائنٹ آتے ہوں گے، اس لئے مختلف اور منفرد قسم کے تجربات بھی ہوتے ہوں گے۔ چنانچہ مجھے اُمید ہے، میں آپ کے لئے کسی اُلجھن کا باعث نہیں بنوں گا۔“

”جی، بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”میرے پیشے میں یہ تو ہوتا ہے۔ بہرحال، آپ کسی طرح کی فکر نہ کریں اور اپنا مسئلہ بیان کر دیں۔“

کریم بھائی نامی وہ شخص پڑھا لکھا اور مہذب تھا۔ اسے پسندیدہ شخصیات میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ میرے تحریک دلانے پر اس نے بولنا شروع کیا۔

”میرا مسئلہ دوسرے لوگوں کے مسائل سے بہت مختلف ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں رف پیڈ اور پین سنبھالتے ہوئے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”اگر کسی شخص کے ساتھ کوئی ناخوشگوار غیر قانونی واقعہ پیش آ جائے تو وہ اس ظلم یا زیادتی کی شکایت لے کر اپنے علاقے کے تھانے پہنچ جاتا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔ ”اور اگر کوئی شخص کسی ناکردہ جرم میں پھنس کر پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو اسے پولیس اور دیگر عدالتی بکھیڑوں سے جان چھڑانے کے لئے کسی تجربہ کار اور قابل وکیل کی خدمات درکار ہوتی ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”آپ ایک حقیقت بیان کر رہے ہیں، اس میں دروغ گوئی کا کوئی عنصر نظر نہیں آتا، لیکن........“ میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن کریم بھائی! مجھے لگتا ہے، آپ کے ساتھ ان دونوں میں سے کوئی بھی صورت نہیں ہے۔ ہے نا؟“

میں نے اس کی نفسیات اور گفتگو کے انداز کو دیکھتے ہوئے ایک تکا لگایا تھا، جو کسی تیر سے بھی زیادہ مؤثر ثابت ہوا........ اور تیر بھی وہ جو ٹھیک نشانے پر جا کر بیٹھتا ہے۔

وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

”ہاشمی صاحب کا اندازہ بالکل درست ہے۔ آپ ایک تجربہ کار اور دُور اندیش

وکیل ہیں۔ مجھے امید ہے، آپ میرا مسئلہ ضرور حل کر دیں گے۔ میں بالکل ٹھیک جگہ پر آ گیا ہوں۔"

"یہ ہاشمی صاحب کون ذاتِ شریف ہیں؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاشمی صاحب میرے ایک ہمدرد اور مخلص دوست ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "ادھر بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) پر ان کی گھڑیوں کی ایک بہت بڑی دکان ہے..... ہاشمی واچز۔" وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"کچھ عرصہ پہلے ہاشمی صاحب کے کسی عزیز نے آپ کی مدد سے ایک کیس جیتا تھا۔ ہاشمی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے مسئلے کے لئے آپ سے مشورہ کروں۔ لہٰذا میں آپ کے پاس آ گیا ہوں۔"

میں نے ذہن پر زور ڈال کر اس کیس کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی، جس کا ذکر ابھی کریم بھائی نے کیا تھا۔ لیکن باوجود اس کوشش کے، مجھے ہاشمی صاحب، ان کے کسی عزیز اور اس کیس کے حوالے سے کچھ یاد نہ آ سکا۔ چنانچہ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ہاشمی صاحب کی مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے یاد رکھا۔"

"تو میں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ...... بلکہ یہ تو آپ ہی نے گیس کر لیا ہے کہ میرا مسئلہ دیگر مؤکلین و مؤکلات سے مختلف نوعیت کا ہے۔" وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "دراصل میں ایک جذباتی اور معاشرتی سچویشن میں پھنس گیا ہوں، لہٰذا مجھے آپ کے قیمتی مشورے کی ضرورت ہے...... ایک مؤثر اور تیر بہ ہدف قانونی مشورے کی ضرورت!"

"میں یہاں قانونی مشورے دینے کے لئے ہی بیٹھا ہوں، کریم بھائی!" میں نے بڑی رسان سے کہا۔ "آپ اپنی پرابلم بیان کریں اور...... اس سے پہلے یہ بتائیں کہ آپ کس شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں؟...... میرا مطلب یہ کہ آپ کا ذریعہ معاش، کاروبار وغیرہ کیا ہے؟"

"کیا اس سے میرے مسئلے کی صحت یا صورت پر کوئی فرق پڑتا ہے؟" اس نے حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے وقت کو ضائع ہونے سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دراصل میں خالصتاً اپنی معلومات کے لئے پوچھ رہا ہوں۔ خیر، آپ مجھے اپنے کسی مسئلے کے بارے میں بتا رہے تھے؟"

"جی ہاں......" اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "وکیل صاحب! آپ نے فرمایا ہے کہ آپ یہاں بیٹھ کر لوگوں کو قانونی مشورے دیتے ہیں، لیکن میرے مسئلے کی خاطر آپ کو بہ نفسِ نفیس متحرک ہونا پڑے گا۔ آپ کی عملی چارہ جوئی ہی میری مشکل کو حل کر کے ایک قیمتی انسانی جان کی آخری گھڑیوں کو آسان بنا سکتی ہے۔"

کریم بھائی کے آخری جملوں نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ پتہ نہیں، وہ کس قیمتی انسانی جان کی آخری ساعتوں کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے بھی پوچھنا ضروری نہیں سمجھا اور اس کے مسئلے کی روح تک محدود رہتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے، قانونی معاملات میں صرف مشوروں سے کام نہیں چلتا۔ ایک وکیل کو تھانے کچہری کے سارے بکھیڑے نمٹانا پڑتے ہیں۔ جو پارٹی بھی مجھے اپنا وکیل کرتی ہے، اس کی حمایت اور سرخ روئی کے لئے مجھے عدالت میں اس کی وکالت کرنا پڑتی ہے۔ یہ میرا اخلاقی فرض اور اس پیشے کا تقاضا بھی ہے۔ لیکن ابھی تک......" میں نے تھوڑا توقف کیا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"کریم بھائی! ابھی تک آپ نے اپنے شغل کے بارے میں نہیں بتایا؟"

"میں ایک چھوٹا سا کاروبار کرتا ہوں۔" وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ "پلازا کے علاقے میں میری تین شاپس ہیں۔ دو آٹو اسپیئر پارٹس کی اور ایک ٹائروں کی۔ یہی میرا شغل ہے اور یہی ذریعہ روزگار۔ میں گلشن اقبال کے ایک صاف ستھرے اور پوش بلاک میں رہتا ہوں۔ میرا گھر دو منزلہ ہے، جو دو سو گز کے پلاٹ پر بنا ہوا ہے۔"

وہ لمحے بھر کے لئے تھما، ایک افسردہ سی سانس خارج کی اور بات کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن میں اپنا جو مسئلہ لے کر آپ کے پاس آیا ہوں، اس کو حل کرنے کے لئے آپ کو عدالتوں کے چکر نہیں کاٹنا پڑیں گے، بلکہ کسی بھی طرح، کوئی بھی ترکیب یا حکمت لڑا کر اسے عدالت سے باہر ہی حل کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں میرا ذہن تو بالکل کام نہیں کر رہا، اسی لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ جتنا بھی خرچہ ہو، میں دینے کو تیار ہوں۔ بس، میرا مقصد حاصل ہو جانا چاہئے۔"

میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"کریم بھائی! میری ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ جو کیس مصالحت اور افہام و تفہیم سے حل ہو سکتا ہے، اس کے لئے عدالت تک جانے سے گریز کیا جائے۔ اس طرح دونوں پارٹیوں کا وقت اور پیسہ برباد ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔ یقین کریں، میں نے درجنوں کیس اسی آفس میں بیٹھے بیٹھے نمٹائے ہیں۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے۔" وہ دعائیہ انداز میں بولا۔ "وکیل صاحب! آپ میری بیوی کی مشکل کو آسان کر دیں تو یہ آپ کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔"

"آپ کی بیوی کی مشکل......؟" میں نے اُلجھن زدہ نظروں سے کریم بھائی کی طرف دیکھا۔

"وکیل صاحب! نورین کو کینسر ہے۔" اس کی آواز بھرّا گئی۔

"نورین......غالباً آپ کی بیوی کا نام ہے؟" میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جی......میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔" وہ پژمردہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔

"کریم بھائی! اگر آپ کی وائف کو کینسر ہے تو ایک وکیل اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہے؟ آپ اسے کسی تجربہ کار آن کالوجسٹ (ماہرِ مرضِ سرطان) کو کیوں نہیں دکھاتے؟ اس کا تو باقاعدہ علاج ہونا چاہئے۔"

"پچھلے چند سال سے نورین کا باقاعدہ ہی علاج ہو رہا ہے، وکیل صاحب!" وہ دکھی لہجے میں بولا۔ "وہ عالمی شہرت کے حامل ایک کینسر اسپیشلسٹ (oncologist) کے زیرِ علاج ہے۔ لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں، کینسر کتنا خطرناک اور موذی مرض

ہے۔"

"ہاں، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن بتائیں کہ میں اس سلسلے میں نورین کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ میں تو بے گناہ ملزموں کے لئے عدالت کے کمرے میں فائٹ کرتا ہوں، کوئی ڈاکٹر تو ہوں نہیں جو کینسر کے مریض کا علاج یا علاج کے حوالے سے کوئی عملی تعاون کر سکوں۔"

"اگر آپ فیصل کو بچا لیں تو نورین کی مشکل میں بڑی حد تک کمی واقع ہو جائے گی۔" اب وہ کہیں اور کی کوڑی لے آیا تھا۔ "فیصل والے معاملے نے اس کی تکلیف میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔ میں جانتا ہوں، وہ اب زیادہ دن تک جی نہیں سکے گی۔ مگر میری خواہش ہے کہ اس کی جتنی بھی سانسیں باقی بچی ہیں، وہ آسانی اور آرام سے پوری ہو جائیں۔ اس کا دل ہر وقت فیصل میں اٹکا رہتا ہے۔"

میں نے اپنے طور پر اندازہ لگایا کہ فیصل ان کا بیٹا تھا اور وہ کسی قانونی جھمیلے میں پھنس گیا تھا۔ کریم چونکہ اپنے گھریلو حالات اور بیوی کی لاعلاج بیماری کے باعث بے حد پریشان تھا، اس لئے اس کے بیان میں ربط اور ضبط نہیں تھا۔ اس کی گفتگو ذہنی پراگندگی اور منتشر خیالی کی عکاس تھی۔

میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کے لئے اس سے پوچھ لیا۔ "کریم بھائی! فیصل آپ کا صاحب زادہ ہے نا؟"

"جی ہاں۔" اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔"

"آپ کا بیٹا کسی پولیس کیس میں پھنس گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی......اللہ نہ کرے۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"پھر......؟" میری حیرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ "آپ نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ اگر میں فیصل کو بچا لوں تو نورین کی مشکل بڑی حد تک کم ہو جائے گی۔ مجھے فیصل کو کس بات، کس مصیبت سے بچانا ہے؟"

"مصیبت......!" وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ نے بالکل صحیح لفظ استعمال کیا ہے، جناب!......نینی کسی مصیبت سے کم نہیں۔ وہ بری طرح فیصل کے پیچھے پڑی ہوئی ہے......اپنے دونوں ہاتھ دھو کر اور......فیصل بھی اس کے ٹرانس

میں ہے۔ ہمارا بیٹا ہم سے چھیننے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ آپ کا کوئی مشورہ ہے، کوئی ترکیب، کوئی تدبیر اور کوئی عملی کوشش ہی اسے بچاسکتی ہے۔ اگر فیصل اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دے یا وہ خوب صورت ڈائن اس کا پیچھا چھوڑ دے تو میری بیوی کی آخری سانسوں میں سہولت اور آسانی پیدا ہوسکتی ہے۔''

میں خیال ہی خیال میں سر پکڑ کر رہ گیا۔ یہ کریم بھائی بڑا عجیب وغریب بندہ تھا اور اس کی باتیں اس سے بھی کہیں زیادہ تعجب خیز اور حیرت آفریں۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا، میں کریم بھائی کی زبانی کوئی الف لیلوی داستان سن رہا ہوں، جس میں ہر موڑ پر ایک نئی کہانی جنم لیتی ہے۔ کریم بھائی کے بعد نورین، نورین کے بعد فیصل اور فیصل کے بعد اب نینی کا کردار اُبھر کر سامنے آیا تھا۔ پتہ نہیں، اس داستان در داستان میں اور کتنے کرداروں کی انٹری باقی تھی۔

''یہ نینی کون ہے؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''نینی کا اصل نام نین تارا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ ایک آزاد خیال اور لوئر فیملی سے تعلق رکھتی ہے اور فیصل کے آفس میں کام کرتی ہے۔ لیکن نینی محض ایک مہرہ ہے، جناب!'' وہ پُرمعنی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

''اوہ........!'' میں نے بے ساختہ ایک بوجھل سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''نینی کس کی بساط کا مہرہ ہے؟''

اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش کرنا عبث ہوتا کہ اب کوئی نیا کردار متعارف ہونے جا رہا تھا۔ اس نے میری توقع کے عین مطابق جواب دیا۔

''اس شخص کا نام عبدالصمد ہے، وکیل صاحب! وہ بنیادی طور پر میرا کاروباری حریف ہے۔ لیکن اس دوڑ میں وہ اس حد تک گر گیا ہے کہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتر آیا ہے۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جیسا کہ میں نے بتایا ہے، نینی فیصل کے آفس میں کام کرتی ہے۔ لیکن یہ پوری طرح صمد کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔ اس نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت نینی کو فیصل کے پیچھے لگایا ہے۔''

''اور یہ بات فیصل کی سمجھ میں نہیں آ رہی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''وہ تو نینی کے عشق میں، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھا ہے جناب!'' وہ دل گرفتہ انداز میں بولا۔ ''میں نے اسے زمانے کی اُونچ نیچ سمجھانے کی ہر کوشش کر کے دیکھ لی ہے، لیکن میرا ہر حربہ ناکامیاب رہا ہے، جبھی تو مجبور ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں۔''

کریم بھائی خاصا دلچسپ کیس تھا۔ اس کی ہر تان مجھی پر آ کر ٹوٹتی تھی۔ اس کی کہانی سننے میں مجھے مزہ آنے لگا تھا۔ میرے پاس بھانت بھانت کے مؤکل آیا کرتے تھے، لیکن کریم بھائی جیسا آج سے پہلے نہیں آیا تھا اور آئندہ کے لئے چونکہ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا، لہٰذا میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ جہاں مختلف النوعیت کے میں نے سینکڑوں، ہزاروں کیس لئے تھے، وہاں ایک اس ٹائپ کا اسوشل ایڈونچر کیس بھی سہی۔ کریم بھائی کے مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل نکالنے کے سلسلے میں، میں اپنے اندر ایک خاص قسم کا تھرل اور سسپنس محسوس کرنے لگا تھا۔ پتہ نہیں کیوں، میں اس غیر روایتی کیس میں دونوں ہاتھ ڈالنے کی شدید خواہش محسوس کر رہا تھا۔ میں ان جذبات کی وجوہ سے واقف نہیں تھا۔

میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کریم بھائی سے پوچھا۔ ''فیصل کس آفس میں کام کرتا ہے؟''

''وہ ایک پرائیویٹ مالیاتی ادارہ ہے، جس کا آفس میکلوڈ روڈ (آئی آئی چندریگر روڈ) پر واقع ہے۔ فیصل نے ایم بی اے کر رکھا ہے اور وہ وہاں ایک اچھی افسرانہ پوسٹ پر کام کرتا ہے۔ جبکہ نینی اسی آفس میں ایک معمولی پوسٹ پر فائز ہے۔'' کریم بھائی نے جواب دیا۔ نینی کا نام اپنی زبان سے ادا کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر کڑواہٹ سی بکھر گئی تھی۔

''مثلاً کون سی پوسٹ؟'' میں نے نینی کے حوالے سے سوال کیا۔

''کلرک، ٹائپسٹ، ریسپشنسٹ........ کچھ بھی کہہ لیں۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ہوں........'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا، پھر سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کریم بھائی! آپ نے تو نینی کو دیکھ رکھا ہوگا؟''

میں لامحالہ اس کے معاملات میں اُترتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے میرے استفسار کے

جواب میں بتایا۔

”کئی مرتبہ جناب! فیصل کے آفس میں کام کرتے ہوئے تو اسے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔ اس سے پہلے وہ عبدالصمد کے پاس تھی۔ وہ اس کے آفس میں اکاؤنٹس وغیرہ دیکھتی تھی اور دیگر دفتری امور بھی۔“

”کیا وہ بہت خوب صورت لڑکی ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ”جی ہاں........وہ حسین وجمیل تو ہے۔“

جب وہ ایک پُرکشش اور خوبصورت لڑکی ہے تو آپ کا بیٹا اس کے عشق میں مبتلا بھی ہے تو ایک کام کیوں نہیں کرتے، کریم بھائی؟“

”کون سا کام، وکیل صاحب؟“ وہ متعجب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”آپ ان دونوں کی شادی کرا دیں۔“

”یہ نہیں ہوسکتا۔“ وہ حتمی انداز میں بولا۔ ”کسی بھی قیمت پر نہیں ہوسکتا۔“

”کیوں........اس میں آخر قباحت ہی کیا ہے؟“ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ”آپ دیکھئے گا، شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ یہی محبت اور چاہت تمام مسائل کو حل کر دے گی۔“

”وکیل صاحب! ایسی غضب ناک باتیں نہ کریں جناب!“ وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔ ”میری بیوی کی حالت بہت نازک ہے۔ یہ خبر سنتے ہی وہ........“ جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ معنی خیز انداز میں خاموش ہوگیا۔

میں نے پوچھا۔

”کیا نورین اس لئے نینی سے نفرت کرتی ہے کہ آپ کے خیال کے مطابق، آپ کے کاروباری حریف عبدالصمد نے آپ کو نقصان پہنچانے کے لئے نینی کو فیصل کے پیچھے لگایا ہوا ہے یا........“ میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یا نورین کی ناپسندیدگی کا کوئی اور سبب ہے؟“

وہ چند لمحوں تک متذبذب نظروں سے مجھے دیکھتا رہا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”وہ بات دراصل یہ ہے کہ فیصل کی منگنی ہو چکی ہے۔ نورین کی بیماری کی وجہ سے

شادی میں تاخیر ہو رہی ہے۔“

”جب وہ منگنی شدہ ہے تو پھر نینی کی محبت میں کیوں گرفتار ہے؟“ میں نے اُلجھن اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے کریم بھائی کی طرف دیکھا۔

”لگتا ہے، اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔“ وہ بے ساختہ بولا۔ ”اور یہ سب نینی ہی کا کیا دھرا ہے۔“

”لیکن مجھے تو کچھ اور ہی محسوس ہو رہا ہے۔“ میں نے تشویش ناک انداز میں کہا۔

”کک........کیا وکیل صاحب؟“ وہ متوحش نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنے خیالات کی ترجمانی میں صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ فیصل اپنی منگنی کو مسترد کر چکا ہے۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ وہ دیدے پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

”اگر میری بات کا یقین نہ آ رہا ہو تو آپ اس سلسلے میں فیصل سے بات کر کے دیکھ لیں۔ اگر وہ اپنی منگنی کو تسلیم کر رہا ہوتا تو یہ اقدام اُٹھا ہی نہیں سکتا تھا۔ ماشاء اللہ! وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار شخص ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار تو ہے، لیکن اس وقت اس کا دل اور دماغ نینی کی مٹھی میں ہے، جو عبدالصمد کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔“

کریم بھائی کے لہجے میں گہری تشویش پائی جاتی تھی۔ ”فیصل کی ہم نے جہاں منگنی کی ہوئی ہے، وہ بہت ہی عزت دار لوگ ہیں، وکیل صاحب! اور وہ لڑکی خاص طور پر نورین کی اوّلین ترجیح اور پسند ہے۔ رخسانہ کی والدہ نورین کی بہت ہی گہری دوست ہے۔ آپ اس جذباتی تعلق کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔“

وہ بولتے بولتے رُکا، ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی، پھر پُراسرار انداز میں بولا۔

”ابھی تک تو رخسانہ اور اس کے والدین کو نینی والے معاملے کی خبر نہیں۔ سوچیں، اگر یہ آگ ادھر پہنچ گئی تو کیا ہوگا؟ ایسے معاملات زیادہ عرصے تک چھپے نہیں رہ سکتے۔ اس کے علاوہ نینی، فیصل کو اُلٹی سیدھی پٹیاں بھی پڑھا رہی ہے۔ وہ اسے ہمارے خلاف کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ وہ ہم پر بھی شک کرنے لگا ہے۔“

وہ اچانک جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

''کس قسم کا شک؟''

''یہ شک کہ......ہم اُس کے سگے ماں باپ نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں، وکیل صاحب!''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' میں نے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''اگر نینی ایسی کوئی کوشش کر بھی رہی ہے تو فیصل کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ آپ لوگوں کو اپنے سگے والدین کیوں نہیں سمجھ رہا؟ نینی کے پاس ایسی کون سی دلیلیں ہیں، جو فیصل اس پر یقین کرنے کو تیار ہو گیا ہے؟''

''دراصل، عبدالصمد ایسے طریقے سے یہ کھیل کھیل رہا ہے کہ حالات اس کی مرضی کے مطابق بنتے جا رہے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''صمد بہت ہی کائیاں اور منتقم المزاج شخص ہے، جناب!''

''کچھ بھی ہے، مگر میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ ایک ایسا شخص جو آپ کی اولاد ہو، آپ نے اسے پال پوس کر بڑا کیا ہو......نہ صرف بڑا کیا ہو بلکہ اسے اعلیٰ تعلیم بھی دلائی ہو، وہ کسی کے بہکاوے میں آ کر اپنی ماں اور باپ کو سوتیلا سمجھنے لگے۔'' میں نے بے یقینی سے کریم بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں مان سکتا۔ ایسا صرف فلموں اور ناولوں وغیرہ میں ہوتا ہے، حقیقی زندگی میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''وہ بات یہ ہے جناب! کہ اس میں فیصل بے چارے کا کوئی قصور نہیں۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔

''قصور نہیں......کیا مطلب؟'' میں نے اُکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''حقیقت یہی ہے۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''اسی لئے میں حد سے زیادہ پریشان ہوں......اور اس مسئلے کے حل کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔''

''یعنی آپ تسلیم کرتے ہیں کہ فیصل آپ کا سگا بیٹا نہیں۔'' میں نے قدرے درشت انداز میں سوال کیا۔ ''آپ اس کے سوتیلے والدین ہیں؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور مجھے اپنی زندگی کے اس نازک اور حساس پہلو

سے آشنا کرنے لگا۔ میں حیرت اور دلچسپی سے اس کی داستان سنتا چلا گیا۔



کریم بھائی نے زندگی کے بہت سارے نشیب و فراز دیکھ رکھے تھے۔ اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز زیرو سے کیا تھا۔ وہ اچھے وقتوں کا میٹرک پاس تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی تعلیم اتنی بے وقعت نہیں ہوئی تھی۔ میٹرک پاس انسان کو بہت پڑھا لکھا، سمجھ دار اور عاقل و بالغ انسان سمجھا جاتا تھا۔ آج کی طرح کا حال نہیں تھا کہ کسی اسٹوڈنٹ کو انگلش میں خط یا درخواست لکھنے کے قابل بننے کے لئے کم از کم ماسٹرز کرنا پڑتا۔ آپ میری اس بات کو طنز سمجھیں یا اظہارِ حقیقت یا غلط بیانی یا جو جی میں آئے، سمجھتے رہیں۔ لیکن حقیقت سے آنکھیں چرانے سے حقائق بدل نہیں جایا کرتے۔ اور حقائق یہ ہیں کہ آج کل کے بہت سے ماسٹرز کو واقعی انگلش میں، چار درست جملے لکھنا نہیں آتے۔ میں انگلش کو کوئی معیار بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے جن مخصوص ماسٹرز کا حوالہ دیا ہے، وہ ریاضی، جنرل نالج اور سائنس وغیرہ کے مضامین میں بھی اتنے ہی قابلِ مذمت ہیں۔ جو حال ان کا انگلش میں ہے اور یہ ہمارے ملک اور یہاں کے تعلیمی نظام کا المیہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ المیہ شدید سے شدید تر اور سنگین سے سنگین ترین ہوتا جا رہا ہے۔ میں، آپ اور ہمارے ہی جیسا کوئی اور شخص کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ ''کرنا'' اور وہ ''ہونا'' جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، انہوں نے ایک پڑھے لکھے پاکستانی کا تعلیمی حلیہ کچھ اس طرح کا بنا رکھا ہے......''جو شخص اُردو کا ایک پیرا پڑھ، لکھ اور بول سکتا ہو، وہ پڑھا لکھا پاکستانی شہری تصور کیا جائے گا۔''

دوسری جانب دنیا میں بعض ایسے ممالک بھی ہیں، جہاں کے عوام صد فیصد پڑھے لکھے ہیں اور ان پڑھے لکھے افراد کا تعلیمی معیار کم از کم گریجویٹ سے شروع ہوتا ہے۔

کریم بھائی نے نوکری کے بجائے بزنس میں ہاتھ ڈالا اور دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور دیگر قریب کے رشتے داروں میں کوئی موجود نہیں تھا۔ لہٰذا اپنی اور اپنی بہن زبیدہ کی زندگی اور مستقبل کے لئے اسے سخت محنت کرنا پڑی تھی اور اطمینان بخش بات یہ تھی کہ قدم قدم پر اس محنت کا صلہ بھی وصول

ہو رہا تھا۔ زیرو سے اپنے کیریئر کا آغاز کرنے والے کریم بھائی نے قدم قدم پر کامیابی حاصل کی اور ایک دن وہ تجربہ کار بزنس مین بن گیا۔ اس دوران جب وقت آیا تو اس نے پہلے زبیدہ کی اور پھر اپنی شادی بھی کر ڈالی۔

وقت دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا۔ کریم بھائی کی بیوی نورین اس سے بھرپور محبت کرتی تھی۔ وہ بھی اسے بہت چاہتا تھا۔ دونوں کسی مثالی جوڑے کے مانند زندگی گزار رہے تھے۔ گھر میں اور گھر کے باہر اللہ کا دیا سب کچھ موجود تھا۔ عزت، دولت، آرام و آسائش........ کسی بھی شے کی کمی نہیں تھی۔ کمی تھی تو صرف ایک چیز کی اور یہ بہت بڑی محرومی تھی........ اُن کے آنگن میں کوئی پھول نہیں کھلا تھا!

شروع کے چند سال تو پتہ ہی نہ چلا کہ کس طرح گزر گئے، پھر گھر سُونا سُونا محسوس ہونے لگا۔ یہ احساس پوری شدت کے ساتھ ان دونوں پر حاوی ہو گیا کہ ان کے گھر میں بھی کسی ننھی جان کی قلقاریاں اُبھرنا چاہئیں۔ وہاں سے بھی بچے کے رونے اور ہمکنے کی صدائیں پیدا ہونا چاہئیں۔ اور........ یہ سب اسی صورت ممکن تھا کہ وہ لوگ صاحب اولاد ہو جائیں۔ مگر........ یہ کسی بھی صورت ہو نہیں پا رہا تھا۔

جب شادی کے دو سال بعد بھی اولاد کی کوئی اُمید یا آثار دیکھنے کو نہ ملے تو انہوں نے ''حسب دستور'' ماہرین امراضِ نسواں اور ماہرین زچہ و بچہ کے کلینکس کے چکر کاٹنا شروع کر دیئے۔ گائنی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کس شے کا علاج کریں۔ دونوں کی میڈیکل رپورٹس اور دیگر پوشیدہ و پیچیدہ معاملات سولہ آنے درست اور صحت مند تھے۔ تجربہ کار اور سنجیدہ لیڈی ڈاکٹرز نے تو انہیں یہی مشورہ دیا کہ وہ دونوں ٹھیک ٹھاک ہیں، انہیں کسی علاج معالجے کی ضرورت نہیں۔ اللہ اللہ کریں جا کر۔

لیکن بعض خالصتاً کاروباری گائنیز نے انہیں مختلف قسم کے کورس بھی کروائے۔ اس غیرضروری اور بے سمت کوشش سے ان گائنیز، میڈیکل اسٹور اور لیبارٹریز والوں کا تو اچھا خاصا فائدہ ہوا مگر ''زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد'' کے مصداق کریم بھائی اور نورین کا کوئی بھلا نہ ہو سکا۔ اس صورتِ حال نے انہیں، خصوصاً نورین کو دل گرفتہ کر دیا۔ ایک روز اس نے کریم بھائی سے کہا۔

''میں تو سمجھ رہی ہوں کہ علاج کے سلسلے میں ہمیں ہر قسم کی کوشش ترک کر کے

صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اس کی جب بھی مرضی ہو گی، میری گود بھر جائے گی۔''

''میں تو یہ بات پچھلے تین چار سال سے تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' کریم بھائی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چلو اچھا ہے........ دیر ہی سے سہی، مگر یہ نکتہ تمہاری عقل میں بیٹھ تو گیا۔''

وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''میں اب تک جو بھی کر رہی تھی، وہ عورت کی فطرت اور وقت کی ضرورت کا تقاضا تھا۔ لوگوں کی سب سے زیادہ باتیں عورت ہی کو سننا پڑتی ہیں، اسے اُٹھتے بیٹھتے خاموش سوالیہ نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عمومی طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ شاید عورت بانجھ ہے، جبھی کوئی خوش خبری سننے کو نہیں مل رہی۔ مرد کی طرف بہت کم لوگوں کا دھیان جاتا ہے۔''

''لیکن ہم دونوں کی میڈیکل رپورٹس اس بات کی گواہ ہیں کہ نہ تو بیج کی کوالٹی میں کوئی فرق ہے اور نہ ہی زمین کی زرخیزی میں کوئی کلام!'' کریم بھائی نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''اس لئے ہمیں لوگوں کی باتوں کی پروا کرنا چاہئے اور نہ ہی اللہ کی رحمت سے مایوسی کا ثبوت پیش کرنا چاہئے۔ اچھا ہے کہ تم بھی اس نقطے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی ہو کہ جب اس قادرِ مطلق کی مرضی ہو گی، ہماری اُمید بر آئے گی۔''

''میں اس نقطے پر تو بہت پہلے ہی پہنچ گئی تھی، لیکن........'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے رُکی، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن اللہ تعالیٰ نے جدوجہد اور کوشش کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ میری وہ ساری بے تابی اور دوڑ دھوپ اسی سلسلے میں تھی۔ بہرحال........'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوئی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''اب میں مطمئن اور پُرسکون ہوں کہ میں نے اپنے فرائض میں کسی کوتاہی یا سستی سے کام نہیں لیا۔ اللہ کا جب حکم ہو گا، ہم صاحب اولاد ہو جائیں گے۔''

اگر ان کی جگہ کوئی اور جوڑا ہوتا تو شاید اتنا متحد اور متفق نظر نہ آتا، جتنا وہ دکھائی دیتے تھے۔ اور اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بڑی گہری اور سچی محبت کرتے ہیں۔ اولاد کی محرومی اپنی جگہ تھی، لیکن زندگی کی زنجیر کی یہ اہم کڑی غیرموجود ہونے کے باوجود بھی ان کے درمیان ایک مائیکرو ایم ایم کا فاصلہ پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ سچی محبت کے جذبے نے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بڑی

مضبوطی سے مربوط اور منسلک کر رکھا تھا۔

قدرت کے کارخانے کا اپنا ایک نظام ہے اور اس نظام تک رسائی ممکن نہیں۔ انسان بس، اندازے اور قیاس کی لہروں میں ڈبکیاں لگاتا رہتا ہے، مگر سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا کہ اس قادرِ مطلق کے کام کا طریق کار کیا ہے اور وہ انسانوں کے لئے کس کس انداز میں آزمائش کی راہ بچھاتا ہے۔ اس کی فیکٹری کے اصول اور ضوابط اٹل ہیں، جہاں ہر کام کے لئے ایک مخصوص وقت مقرر ہے۔ نہ ایک سیکنڈ پہلے اور نہ ہی ایک سیکنڈ بعد میں۔

کریم بھائی کی زندگی کا بھی ایک لائحہ عمل طے شدہ تھا۔ وہ دونوں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، لیکن قدرت نے انہیں اولاد ایسی نعمت سے محروم کر رکھا تھا۔ اس میں قدرت کی کون سی مصلحت پوشیدہ تھی، یہ اس وقت کھلا جب زبیدہ کی زندگی اچانک ختم ہوگئی۔

کریم بھائی کی طرح، زبیدہ کے ساتھ بھی اولاد سے محرومی والا معاملہ چل رہا تھا۔ شادی کے کئی سال بعد بھی وہ ماں نہیں بن سکی تھی، لیکن بھائی کی بہ نسبت بہن کی آزمائش نرم ثابت ہوئی اور چار پانچ سال کی محرومی کے بعد اس کی گود ہری ہوگئی۔ اس نے ایک خوب صورت بیٹے کو جنم دیا تھا۔ لیکن جب وہ بچہ سال بھر کا ہوا تو قدرت نے اس کے والدین کو چپکے سے اپنے پاس بلا لیا۔ زبیدہ اور اس کا شوہر ادریس ایک ٹریفک ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر اس دنیا سے اُس دنیا میں منتقل ہو گئے۔ بچے کو جینا تھا، لہٰذا وہ خوش قسمتی سے اس خطرناک حادثے کے وقت اپنے ماں باپ کے ساتھ نہیں تھا، چنانچہ اس اندوہ ناک اتفاقی حادثے نے ایک سال کے ننھے منے فیصل کو نورین کی گود میں پہنچا دیا۔

فیصل کا اس دنیا میں، کریم بھائی سے زیادہ اور کوئی خیر خواہ ہو نہیں سکتا تھا۔ وہ فیصل کا اکلوتا سگا ماموں تھا۔ ماموں چونکہ اکلوتا تھا، لہٰذا نورین کی حیثیت بھی اکلوتی ممانی ایسی تھی اور وہ خود بھی ان کا اکلوتا بھانجا تھا۔ ایک سال کی عمر ایسی نہیں ہوتی کہ بچہ کچھ زیادہ یاد رکھ سکے۔ فیصل اپنے والدین کو بھول کر ماموں ممانی کا ہو گیا اور انہوں نے بھی اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ وہ دونوں اسے بیٹا بنا کر اس کی پرورش کریں گے۔ بس،

اس دن سے وہ اسے اپنی سگی اولاد سمجھ کر پالنے لگے۔ فیصل نے بھی ذہنی اور نفسیاتی طور پر انہیں اپنا ماں باپ تسلیم کر لیا تھا۔

ادریس کا کوئی قریبی عزیز رشتے دار نہیں تھا، جو فیصل کے حصول میں دلچسپی لیتا۔ دور پار کے رشتے داروں نے شکر کیا کہ ماموں اپنے بھانجے کو لے گیا ہے، ورنہ خوامخواہ انہیں ایک بچے کی پرورش کی ذمے داری اُٹھانا پڑتی۔ شاید اسی وجہ سے قدرت نے نورین کی کوکھ کو سُونا رکھا تھا کہ فیصل کی شکل میں اسے ایک بیٹا ملنے والا تھا۔ دوسری طرف فیصل کا مستقبل بھی قدرت کی نظر میں تھا۔ اگر کریم بھائی اور نورین اسے دل و جان سے نہ اپناتے تو اس ننھے سے بچے کی زندگی عجیب و غریب مسائل کا شکار ہو جاتی۔ شاید ایسے ہی مواقع کے لئے کہا گیا ہے........ وقت کرتا ہے پرورش برسوں، حادثہ ایک دم نہیں ہوتا!

نورین کی بے مزہ زندگی میں جیسے بہار آ گئی تھی۔ فیصل کی ''آمد'' نے اسے بے پناہ مصروف کر دیا تھا۔ پہلے وقت تھا کہ کاٹے نہیں کٹتا تھا اور اب بہت سے کام دھرے رہ جاتے تھے اور ان کے لئے وہ وقت نہیں نکال پاتی تھی۔ ایک ننھی سی جان نے اس کی جون ہی بدل ڈالی تھی۔

ایک روز اس نے کریم سے کہا۔

''میں مانتی ہوں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ فیصل آپ کا رشتے میں بھانجا ہے اور اسی رشتے سے وہ میرا بھی بھانجا ہے۔ لیکن چند دن ہی میں مجھے اس سے ایسی محبت ہو گئی ہے کہ یہ مجھے اپنے جگر کا ٹکڑا محسوس ہونے لگا ہے۔ یوں لگتا ہے، اسے زبیدہ نے نہیں بلکہ میں نے جنم دیا ہو۔''

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے، نورین!'' کریم بھائی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں خود بھی فیصل کے لئے ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔''

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا........'' نورین کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

کریم نے جلدی سے پوچھا۔ ''کیسا نہیں ہوسکتا؟''

''کیا ہم اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ فیصل زبیدہ اور ادریس کی اولاد ہے۔'' نورین نے دل کی بات زبان تک لاتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنے ذہن کو اس بات

پر سیٹ کر لیتے ہیں کہ فیصل ہماری اولاد ہے۔ ہم زندگی بھر اس کے حقیقی والدین بن کر رہیں گے اور اسے کبھی بھی یہ احساس نہیں ہونے دیں گے کہ میں نے اسے جنم دیا ہے۔ جب ہم اسے اپنا بچہ سمجھ کر پالیں گے تو ظاہر ہے، وہ بھی ہمیں اپنے سگے ماں باپ ہی سمجھے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''تمہارا خیال چونکہ نیک ہے، اس لئے میں تمہارا ہم خیال ہوں۔'' کریم بھائی نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''ہم خیال ہونے کے ناتے میں اس منصوبے میں تمہارا بھرپور ساتھ دوں گا، لیکن......'' کریم بھائی نے سانس درست کرنے کے لئے توقف کیا تو نورین نے جلدی سے پوچھا۔

''لیکن کیا......کریم؟''

''لیکن یہ کہ ہمارے ایسا سمجھنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بہرحال، ہم حتیٰ الامکان کوشش کریں گے کہ خود کو اس کے حقیقی والدین ثابت کر سکیں۔ آگے اللہ کی جو مرضی۔''

''ایک کام کرتے ہیں، کریم!'' نورین نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

کریم نے پوچھا۔ ''تمہارے ذہن میں اب کون سی بات آئی ہے؟''

''ہم ناظم آباد میں رہتے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اور فیصل کے چند ددھیالی رشتے دار ادھر بفرزون میں رہائش پذیر ہیں۔ اگرچہ انہوں نے فیصل کے حصول کے لئے کوئی چارہ جوئی کی ہے اور نہ ہی ایسی کوئی دلچسپی ظاہر کی ہے، جس سے واضح ہوتا ہو کہ انہیں اس بچے سے کوئی مطلب ہے۔ لیکن مستقبل میں اگر کسی کو فیصل کا خیال آ گیا تو ہمارے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ میں کسی بھی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتی، لہٰذا......'' وہ تھوڑی دیر کے لئے تھمی، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''ہمیں فوری طور پر اپنی رہائش تبدیل کر لینا چاہئے۔ تاکہ کبھی کوئی ہم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔''

کریم تھوڑی دیر کے لئے گہری سوچ میں ڈوب گیا، پھر تشویش ناک لہجے میں بولا۔

''میرا سارا کاروبار ادھر کراچی میں پھیلا ہوا ہے۔ فوری طور پر یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں شفٹ ہونا اتنا آسان نہیں ہوگا۔''

''میں رہائش تبدیل کرنے کی بات کر رہی ہوں۔'' نورین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کراچی چھوڑ کر کسی اور ضلع میں بسنے کو نہیں کہہ رہی ہوں۔''

''او کے!'' وہ اطمینان بھرے انداز میں بولا۔ ''یہ کیا جا سکتا ہے۔''

پھر ایک ماہ کے اندر ہی کریم بھائی نے رہائش کی تبدیلی کا بندوبست کر لیا۔ اس نے نہایت ہی خاموشی کے ساتھ ناظم آباد کو خیرباد کہا اور گلشن اقبال منتقل ہو گیا۔ یہ شفٹنگ اتنی احتیاط کے ساتھ اور چپ چاپ کی گئی تھی کہ اس کے ناظم آباد والے پڑوسیوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ یہ تمام احتیاطی تدابیر اس لئے اختیار کی گئی تھیں، تاکہ فیصل کی ددھیال کا کوئی آدمی پوچھتے پاچھتے، سراغ لگاتے ان تک نہ پہنچ جائے!

نورین، فیصل کی سگی ماں نہیں تھی، لیکن سگی ماں سے بڑھ کر حفاظتی انتظامات اور پیش بندیاں کر رہی تھی۔ کریم بھی اس مرحلے پر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ جب وہ رہائش بدل کر کسی نئے علاقے میں چلے جائیں گے تو فیصل کی ددھیال کی طرف سے کوئی انہیں ڈھونڈ نہیں سکے گا۔ لیکن وہ بھول گیا تھا کہ جب یہ پوری دنیا ہی بہت چھوٹی ہے تو پھر کراچی شہر کی کیا حیثیت ہے!

انہوں نے رہائش تبدیل کی تھی، لیکن کریم کا بزنس ہنوز اسی جگہ پر تھا۔ کیونکہ چلتے ہوئے بزنس کو مارکیٹ سے اُٹھا کر کہیں اور لے جانا سخت بے وقوفی ہوتی۔ پلازا کا علاقہ اس کے کام کے حوالے سے کسی گولڈ مارکیٹ سے کم نہیں تھا۔

چند روز بعد کریم بھائی نے ایک ایسے آدمی کو مارکیٹ میں دیکھا، جو زبیدہ کی سسرال سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن یہ دور پار کا ہی رشتے دار تھا۔ زبیدہ کے شوہر ادریس سے اس کی کوئی قریبی رشتے داری نہیں تھی۔ مذکورہ شخص بھی آٹو اسپیئر پارٹس اور ٹائرز وغیرہ کا کام کر رہا تھا۔ کریم بھائی سے کبھی کبھار اس کی ملاقات ہو جاتی تھی، لیکن اس شخص نے کبھی فیصل کا حوالہ دیا اور نہ ہی اس کے بارے میں کبھی گفتگو کی۔ اس صورت حال نے کریم بھائی کو اور بھی مطمئن کر دیا تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور اس رفتار کے ساتھ ہی کریم بھائی بھی ترقی کرتا چلا گیا۔ اسپیئر پارٹس کی ایک سے دو دُکانیں ہوگئیں اور گاڑیوں کے ٹائرز وغیرہ کا بزنس بھی پھولتا پھلتا چلا گیا۔ کریم بھائی نے اپنے بزنس میں انویسٹمنٹ کے علاوہ پراپرٹی کے کام میں بھی ہاتھ ڈال دیا اور پلاٹس وغیرہ کی خرید وفروخت کرنے لگا۔ تاہم یہ اس کا پارٹ ٹائم بزنس تھا۔ اس کی اصل توجہ پلازا والی دکانوں پر مرکوز تھی۔

کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ پیسہ، پیسے کو کھینچتا ہے۔ پہلا لاکھ (اُس زمانے کے لحاظ سے کہہ رہا ہوں) جمع کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے بعد تو یہ لاکھ خود ہی لاکھوں اور کروڑوں کو دعوت دے کر اپنے پاس بلاتا ہے اور بزنس مین لاکھ سے کروڑ اور کروڑ سے ارب پتی ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال کریم بھائی پر بھی صادق آتی تھی۔ رفتہ رفتہ پلاٹس کی خرید وفروخت کے علاوہ اس نے فلیٹس کی شکل میں بھی پراپرٹی بنانا شروع کر دی۔ واضح رہے کہ زیرِ نظر واقعہ آج سے بتیس، چونتیس سال پہلے کا ہے!

دوسری جانب فیصل کی پرورش، تعلیم اور نگہداشت پر بھی دونوں میاں بیوی کی گہری نظر تھی۔ ان شعبوں میں فیصل کو کسی قسم کی کمی یا محرومی کا احساس نہیں ہوا اور اس نے مختلف نوعیت کے تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے بالآخر ایم بی اے کر لیا۔

کریم بھائی کی خواہش تو یہی تھی کہ فیصل اس کے بزنس کو سنبھالے۔ اس نے بزنس پڑھا تھا، لہٰذا اس شعبے میں کریم بھائی سے زیادہ آسانی سے ترقی کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے اپنی فیصلہ نما خواہش کو فیصل پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ وہ بیٹے کی مرضی اور رجحان کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا تھا۔ فیصل چاہتا تھا کہ وہ کچھ عرصہ کسی بڑے ادارے میں کام کرے گا، اس کے بعد اپنا انڈیپنڈنٹ بزنس سیٹ کرے گا۔

کریم بھائی کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی اور وہ تنگ دل وتنگ نظر بھی نہیں تھا، لہٰذا وہ فیصل سے تعاون کے لئے تیار تھا۔ فیصل اپنی پسند کے بزنس کے لئے اس سے جتنی بھی دولت مانگتا، وہ کبھی انکار نہ کرتا۔ فیصل تو ان کی زندگی کا آخری سہارا، ان کی آنکھوں کا تارا تھا۔

فیصل نے ایم بی اے کر لیا اور ایک معروف مالیاتی ادارے میں ملازم بھی ہو گیا۔ لیکن اس سے پہلے اور اس دوران میں چند ایسے واقعات بھی رونما ہوئے جو غیر معمولی

ہونے کے ساتھ ساتھ اذیت ناک بھی تھے۔ فیصل اپنی تعلیم کے آخری مراحل میں تھا کہ نورین بیمار ہو گئی۔ یہ بیماری جب دنوں، ہفتوں سے آگے بڑھ کر مہینوں میں داخل ہوئی تو اسپیشلسٹ وغیرہ کو اپروچ کیا گیا۔ تب مختلف نوعیت کے ٹیسٹ کے بعد پتہ چلا کہ نورین کو بریسٹ کینسر ہے!

اُس زمانے میں سرطان کے بہت کم کیسز ریکارڈ پر آتے تھے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ پاکستان میں یہ مرض ابھی نیا نیا متعارف ہوا تھا اور ظاہر ہے، آج کل کی طرح علاج و معالجے کی سہولیات بھی میسر نہیں تھیں۔ جہاں تک علاج کے اخراجات کا تعلق ہے تو زمانہ وہ ہو یا یہ........ ہمیشہ یہ مہنگا ترین ہی رہا ہے۔

کریم بھائی کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی، لہٰذا اس نے بیوی کے علاج کے لئے پیسہ بقول شخصے، پانی کی طرح بہانا شروع کر دیا۔ بے تحاشا دولت خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ ذہن ان خدشات سے بھی بھرا ہوا تھا کہ یہ علاج ایک ڈھکوسلا ہے۔ دنیا کا کوئی ڈاکٹر کینسر کے مریض کو بھلا چنگا نہیں کر سکتا۔ اس مرض کی باقاعدہ تشخیص گویا مریض کی موت کا اعلان ہے........!

آج کل اس مرض کے حوالے سے بہت زیادہ ریسرچ ہو چکی ہے اور جدید ترین علاج کم وقت میں مریض کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچا دیتا ہے۔ اگرچہ یہ آرام دیرپا یا مستقل نہیں ہوتا۔ بہرحال، آج سے تیس پینتیس سال پہلے تک تو اتنی سہولت بھی نہیں تھی۔ چنانچہ کریم بھائی کی دولت، سکون اور آرام نورین کی بیماری کی نظر ہونے لگا۔ آنے والے چند سالوں میں کریم بھائی نے دکھ، تکلیف، کرب اور اذیت کی اتنی منازل طے کیں کہ جن کی تفصیل بیان کرنے کے لئے پورا ڈائجسٹ بھی کم پڑے گا۔ لہٰذا نہایت ہی مختصر الفاظ میں، میں صرف اتنا کہوں گا کہ........ بینک بیلنس ختم ہونے کے بعد پراپرٹی کی فروخت کا نمبر آیا۔ پہلے پلاٹس اور پھر فلیٹس ایک کے بعد ایک فروخت ہوتے چلے گئے۔ اور اب صرف تین دکانیں باقی تھیں۔ دو آٹو اسپیئر پارٹس کی اور ایک ٹائرز وغیرہ کی۔ اور نورین کا یہ عالم تھا کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی........!

مرض جیسے جیسے آگے بڑھا، علاج اتنا ہی سخت، تکلیف دہ اور مہنگا ہوتا چلا گیا۔ پھر وہی ہوا جو اس طرح کے کاموں یعنی اس طرح کے امراض میں ہوتا ہے۔ پہلے نورین کا

ایک بریسٹ کٹا، پھر دوسرا، سر اور جسم کے دوسرے حصوں سے بال اُڑ گئے اور جلد کی رنگت بھی افسوس ناک ہوگئی۔ یہ سب ان خطرناک ادویات اور دیگر طریقہ علاج کا نتیجہ تھا، جو کینسر سے لڑنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ پھر ایسا وقت بھی آیا کہ ڈاکٹروں نے نورین کو دیگر فیملی ممبرز سے بالکل الگ رکھنے کی تجویز دی۔ چنانچہ اسے گھر کی بالائی منزل پر شفٹ کر دیا گیا۔

شروع شروع میں ''ملاقاتیوں'' کو گھر کے اس حصے میں جانے اور نورین سے ملنے کی اجازت تھی، لیکن بعد ازاں، اس کی بگڑتی ہوئی طبیعت اور خطرناک علاج کے باعث ان ملاقاتیوں (عیادت گزاروں) پر پابندی لگا دی گئی۔ ڈاکٹر کے علاوہ صرف کریم بھائی کو نورین کے پاس جانے کی اجازت تھی اور وہ بھی مخصوص انتظامات کے بعد۔ وہ مخصوص قسم کا ماسک لگا کر اپنی بیوی سے ملنے جاتا تھا، ہاتھوں پر بھی خاص نوعیت کے دستانے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی احتیاطی تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔

جن دنوں نورین کو بالائی منزل پر شفٹ کیا گیا، اسے ڈاکٹروں کا تختۂ مشق بنے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ اپنی بیماری کی نوعیت اور علاج کے اخراجات سے بہ خوبی واقف تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی عورت تھی، لہٰذا کینسر کی ہلاکت خیزی سے بھی آشنا تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کسی بھی صورت بچے گی نہیں۔ ایک روز اس نے کریم بھائی سے کہا۔

''کریم! میں جانتی ہوں، تم مجھ سے بہت محبت کرتے ہو......''

کریم اس کا ہاتھ تھامے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا، بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں، اس کا تو مجھے اندازہ نہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تمہاری مجھ سے محبت، اس محبت سے کہیں زیادہ ہے۔''

''تم ہمیشہ الفاظ کا کھیل، کھیل کر مجھے چت کر دیتے ہو۔'' وہ نقاہت آمیز لہجے میں بولی۔

کریم بھائی نے برجستہ کہا۔

''اور تمہیں یہ کارنامہ انجام دینے کے لئے الفاظ کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تم

مجھ پر ایک محبت بھری نگاہ ڈالتی ہو اور میں چاروں خانے چت ہو جاتا ہوں......!''

''تم نے پھر الفاظ کی بازی گری شروع کر دی۔'' وہ میٹھی شکایت کرتے ہوئے بولی۔ ''میں دراصل تم سے ایک خاص بات کرنا چاہتی تھی۔''

''میرے لئے تمہاری ہر بات ہی خاص ہوتی ہے۔'' وہ نورین کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولا۔ ''خیر کہو، تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

''میرا خیال ہے، یہ علاج روک دینا چاہئے۔'' وہ چھت کو گھورتے ہوئے بولی۔

کریم بھائی پر جیسے بجلی سی گر پڑی، وہ چونکتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ کریم......!'' وہ گمبھیر انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ بات تم بھی جانتے ہو، میں بھی جانتی ہوں اور ہم دونوں سے کہیں زیادہ ڈاکٹر جانتا ہے کہ کینسر ایک لاعلاج مرض ہے اور میں آج کل علاج کے جن مراحل سے گزر رہی ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ میری زندگی بہت زیادہ باقی نہیں بچی، لہٰذا......!''

نورین لمحے بھر کے لئے، سانس ہموار کرنے کو رکی تو کریم بھائی نے تڑپ کر کہا۔

''ایسی باتیں نہ کرو، نورین! مجھے یقین ہے، تم ایک دن بھلی چنگی ہو جاؤ گی۔ میں تمہارے علاج پر......''

''پیسہ، پانی کی طرح بہا رہا ہوں اور دونوں ہاتھوں سے خرچ کر رہا ہوں۔'' کریم کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی نورین بول اُٹھی۔ وہ گویا، کریم کے جملے کو مکمل کر رہی تھی۔

کریم نے ایسی نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھا، جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اسے کیا کہنا چاہئے۔ نورین نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔

''میں ایک خطرناک اور جان لیوا بیماری کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہوں، کریم! اور جانتی ہوں کہ اس بیماری کے علاج کے لئے بے تحاشا رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ تم اس علاج کے سلسلے میں کسی کوتاہی یا کنجوسی کا مظاہرہ بھی نہیں کر رہے۔ یہ بات میرے علم میں ہے کہ تمام فلیٹس اور پلاٹس فروخت ہو چکے ہیں، بینک بیلنس زیرو ہے۔ اس دو منزلہ مکان اور تین دکانوں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ اور اگر سال، ڈیڑھ

سال مزید علاج چلتا رہا تو ہم لوگ بے گھر ہونے کے ساتھ ہی بے روزگار بھی ہو جائیں گے۔ جبکہ یہ بات بھی طے ہے کہ کسی بھی صورت مجھے صحت ملنے والی نہیں، للہٰذا علاج کو مزید جاری رکھنا حماقت ہوگی۔ کریم!......... تم یہ سب کچھ ایک ایسے کنوئیں میں ڈال رہے ہو، جس کا کوئی پیندا ہی نہیں ہے......... یہ ایک اندھا کنواں ہے، کریم!''

''تم جیسا چاہ رہی ہو، ویسا میں کر نہیں سکتا، نورین!'' کریم بھائی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہارے علاج کے حوالے سے، جب میرے پاس بیچنے کے لئے کچھ نہیں بچے گا تو میں اس وقت خود کو بیچ دوں گا، لیکن کسی بھی صورت تمہارے علاج سے ہاتھ نہیں کھینچوں گا۔ تمہاری مایوسی نے مجھے دُکھی کر دیا ہے، نورین!''

''تمہیں دُکھی کرنا میرا مقصد نہیں تھا، کریم!'' وہ دُور خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔

''میں نے تو حقیقت بیان کی ہے۔ سرطان بڑی ٹھوس اور سفاک حقیقت ہے۔''

''اگر کوئی اپنا......... کوئی پیارا کسی موذی مرض میں مبتلا ہو جائے تو اسے بے یارومددگار نہیں چھوڑا جا سکتا۔'' کریم نے پُرعزم انداز میں کہا۔ ''تم تنہا اور بے آسرا نہیں ہو، نورین! میں تمہارے علاج اور تمہاری دیکھ بھال سے کبھی پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ آئندہ تم اس موضوع پر مجھ سے بات نہیں کرنا۔''

وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر رنجیدہ لہجے میں بولا۔

''میرا سب کچھ تم سے ہے، نورین! اگر تم نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ تمہاری کتنی زندگی بچی ہے اور نہ ہی مجھے یہ معلوم ہے کہ میں کتنا عرصہ جی سکوں گا۔ زندگی اور موت کا حساب کتاب اس قادرِ مطلق نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔''

''حقائق سے نگاہ چرالیں تو اس سے حقیقت بدل نہیں جاتی، کریم!'' نورین نے ٹھوس الفاظ میں کہا۔ ''میں نے تم سے کوئی بھی ان ہونی بات نہیں کی۔''

''میں ہونی اور ان ہونی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا، نورین!'' وہ اُلجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''خدانخواستہ اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو میں بھی.........''

نورین نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ کریم کو تو معلوم ہی تھا کہ وہ اس جملے کو کس طور مکمل کرنے والا تھا، لیکن نورین کے فوری ردِعمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی اپنے شوہر کے ''مبینہ'' عزائم سے واقفیت رکھتی تھی، جبھی اس

نے کریم بھائی کو آگے کچھ بھی نہیں کہنے دیا تھا۔ یہ اس کی، اپنے شوہر سے منہ بولتی محبت کا ثبوت تھا۔

وہ اس کے ہونٹوں پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔

''کریم! تم اس وقت بہت زیادہ جذباتی ہو رہے ہو۔''

''محبت تو جذبات کے اظہار ہی کا نام ہے، نورین!''

''تو کیا میں تم سے محبت نہیں کرتی ہوں؟''

''میں نے ایسا کب کہا ہے؟...... کب سوچا ہے؟'' کریم بھائی بری طرح بوکھلا گیا۔

''نہیں کہا......... اور نہ ہی سوچا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''لیکن انسان کو اپنے جذبات کے اظہار میں بھی اہم باتوں کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ میں اس موذی مرض کے ساتھ بھی سب کچھ یاد رکھے ہوئے ہوں اور تم.........؟''

نورین نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر بولا۔

''مم......... میں کیا......... میں نے کیا بھلا دیا ہے؟''

''فیصل کو۔''

''فیصل؟'' کریم بھائی کی اُلجھن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ ''میں تمہاری بات کو سمجھ نہیں سکا ہوں، نورین!''

وہ کمزور سے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''یہ سچ ہے کہ فیصل ہماری سگی اولاد نہیں، لیکن ہم نے اسے جس توجہ اور محبت سے پروان چڑھا کر یہاں تک پہنچایا ہے، شاید اس کے حقیقی والدین بھی اس کے لئے اتنا نہیں کر سکتے۔ اس کے پاس صحت ہے، جوانی ہے، وجاہت ہے، اعلیٰ تعلیم ہے اور تابناک مستقبل ہے.........''

نورین سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوئی تو کریم بھائی کوئی سوال کئے بغیر، گہری دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے نقاہت بھرے لہجے میں بولی۔

''لیکن اس کی زندگی بھی مکمل نہیں ہوئی۔ اس زندگی میں ایک کمی، ایک خلا موجود

ہے۔ میں سمجھتی ہوں، اب جلد از جلد اس کی شادی ہو جانا چاہئے۔ میں یہ کام اپنی زندگی میں، اپنے ہاتھوں سے کرنے کی خواہش مند ہوں اور اس سلسلے میں، میں نے کچھ سوچ بھی لیا ہے...... بلکہ سوچا تو بہت پہلے تھا، اب عمل کا وقت آ گیا ہے۔"

کریم بھائی اپنی بیوی کی صحت اور بیماری سے اچھی طرح واقف تھے، ان لمحات میں نورین جس تندرستی اور تازگی سے بات کر رہی تھی، اس پر کریم بھائی کو تعجب تھا۔ بہرحال، اس نے ایک مرتبہ پھر کوئی سوال اُٹھانے کی کوشش نہیں کی اور دھیمے لہجے میں بولا۔

"ہاں تو بتاؤ...... تمہارے ذہن میں کیا ہے؟ تم نے کیا سوچا ہے؟"

وہ گہری سنجیدگی سے مستفسر ہوئی۔

"کریم! تم نگہت سلیم کو تو جانتے ہو نا؟"

"ہاں، اچھی طرح جانتا ہوں۔" وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "نگہت سلیم تمہاری سب سے گہری دوست ہے۔ اس کا اکثر فون بھی آتا رہتا ہے۔ نگہت کا شوہر سلیم احمد ایک معروف کاروباری آدمی ہے۔ خالد بن ولید روڈ پر اس کا کاروں کا بزنس ہے...... سلیم موٹرز!"

"ہاں، میں اپنی اسی دوست نگہت سلیم کی بات کر رہی ہوں۔" نورین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کی صرف ایک ہی بیٹی ہے...... رخسانہ! میں رخسانہ سے کئی مرتبہ مل چکی ہوں اور اس کے سلسلے میں نگہت سلیم سے بھی بات ہوتی رہی ہے۔ رخسانہ ہمارے فیصل کے لئے ہر لحاظ سے موزوں ترین ہے۔ اس نے انگلش میں ماسٹرز کیا ہے۔ خوبصورت اور سلیقہ شعار ہے۔ خاندان بھی اعلیٰ اور معزز ہے۔ میں ان لوگوں کو برسوں سے جانتی ہوں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"سمجھ رہا ہوں۔" کریم بھائی نے جلدی سے سر کو اثباتی جنبش دی اور پوچھا۔ "کیا خصوصاً اس رشتے کے حوالے سے تمہاری کبھی نگہت سلیم سے بات ہوئی ہے؟"

کریم بھائی بنیادی طور پر ایک بزنس مین تھا، اس لئے بھی یہ رشتہ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اعلیٰ خاندانی ہونے کے علاوہ رخسانہ کا پس منظر بھی خاصا مضبوط تھا۔ وہ "سلیم موٹرز" کے بزنس سے اچھی طرح واقف تھا، جبھی رضامندانہ انداز میں وہ نورین سے تصدیق چاہ رہا تھا۔ نورین نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

"میں اور نگہت سلیم تو اس رشتے کے لئے ایک سو ایک فیصد راضی ہیں، سلیم صاحب نے بھی مخالفت نہیں کی۔ تم گرین سگنل دو تو میں بات کو آگے بڑھاؤں۔" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی، ہلکا سا کھانسی اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"کریم! میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اور......"

"کسی بھی شخص کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، نورین!" وہ بیوی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھا، پھر بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ کون کتنے دن جیے گا۔ تم خوامخواہ اپنی زندگی اور موت کی بات نہ کرو۔"

"میں تمہارے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔" وہ گمبھیر انداز میں بولی۔ "یہ تمہاری محبت ہے کہ تم میری موت کا ذکر سننے کے روادار نہیں ہو۔ لیکن اس سے حقائق میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی، بہرحال......" اس نے تھوڑا توقف کر کے ایک سکون بھری سانس خارج کی اور بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"میں اب چند دن...... یا چند ماہ کی مہمان ہوں لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ اگر تم اس رشتے کے لئے تیار ہو جاؤ تو میں اپنی آنکھ بند ہونے سے پہلے فیصل کا سہرا ضرور دیکھ لوں گی۔ آگے اللہ کو جو بھی منظور ہو......!"

کریم بھائی نے بیوی کی خواہش کو پورا کر دیا۔

جب کریم بھائی پریشان حال مجھ سے ملنے آیا تو فیصل کی منگنی کو لگ بھگ آدھا سال گزر چکا تھا۔ دونوں پارٹیوں کی کوشش تو یہی تھی کہ جلد از جلد یہ شادی انجام بخیر ہو جائے۔ لیکن اس دوران میں نورین کی طبیعت دو تین مرتبہ ایسی بگڑی کہ یہ اقدام اُٹھانا ممکن نہ رہا، اور اب......!

اب ایک نیا عذاب سامنے آیا تھا۔ نینی نے فیصل کی زندگی میں داخل ہو کر ایک تہلکہ سا مچا دیا تھا۔ اس کی کارفرمائی کی خبر ابھی تک رخسانہ اور اس کے گھر والوں کو نہیں تھی اور نہ ہی نورین کو ابھی اس فتنے سے آگاہ کیا گیا تھا۔ کریم بھائی نے مجھے جو تفصیلات بتائی تھیں، ان کے مطابق، ایک خطرناک طوفان سر اُٹھا چکا تھا۔ اگر فیصل اس کے ہاتھ میں ہوتا تو کریم بھائی نین تارا عرف نینی اور اس کے پشت پناہ عبدالصمد سے اچھی طرح نمٹ لیتا، بلکہ...... انہیں ایسا سبق سکھاتا کہ زندگی بھر یاد رکھتے۔ لیکن

یہاں تو نقشہ ہی اُلٹا ہوا تھا۔ کریم بھائی کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہا تھا اور وہ کسی بھی قیمت پر اپنی بیوی کو، اس کی زندگی کی آخری سانسوں میں کوئی بڑا صدمہ پہنچتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا، جبھی گھبرا کر وہ میرے پاس آیا تھا، تاکہ میں اس کی مشکل کو حل کر دوں۔

یہ کیس میرے لئے بالکل مختلف اور منفرد نوعیت کا تھا۔ جس میں عدالت میں قدم رکھے بغیر مجھے کسی معاشرتی مصلح کا کردار ادا کرتے ہوئے معاملات کو کنٹرول کر کے کریم بھائی کی موافقت میں لانا تھا، تاکہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی محفوظ رہے۔

میں نے آج سے پہلے اس قسم کا کوئی کیس کبھی نہیں لیا تھا، لیکن کریم بھائی کے حالات اور موجودہ سچویشن نے میری دلچسپی کو کشش کر لیا تھا۔ مجھے یقین تھا، عدالت کے باہر قانونی داؤ پیچ اور معاشرتی جوڑ توڑ کرنے میں مجھے مزہ آئے گا اور میں کریم بھائی کا مسئلہ حل کر دوں گا۔

ایک سنسنی خیز ایڈونچر سمجھتے ہوئے، میں نے اس وکھری ٹائپ کے کیس کو لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بقول نورین...... آگے اللہ کو جو منظور ہو!

●.....●.....●

کریم بھائی بڑی اُمید بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا!

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

”کریم بھائی! کیا یہ بات سلیم احمد اور اس کی بیوی نگہت سلیم کو معلوم ہے کہ فیصل آپ کا سگا بیٹا نہیں؟“

”نہیں...... وہ لوگ یہ بات نہیں جانتے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”اوہ......!“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”دراصل، جب ہم ناظم آباد سے شفٹ ہو کر گلشن اقبال آئے تھے تو ہم نے آپس میں ایک عہد کیا تھا کہ فیصل کی حقیقت صرف ہم دونوں کے درمیان رہے گی۔ نگہت اور نورین کی دوستی بعد میں ہوئی تھی۔ جب ہم گلشن اقبال میں آ کر آباد ہوئے تو نگہت ہمارے پڑوس میں رہتی تھی اور فیصل ابھی بہت چھوٹا تھا۔ ان لوگوں کو ہم نے یہی بتایا تھا کہ فیصل ہماری اکلوتی اولاد ہے۔ اسی طویل ہمسائیگی کے دوران ہی نورین اور نگہت

کے درمیان دوستی مضبوط ہوئی تھی۔

ہم کافی عرصے تک ایک دوسرے کے پڑوسی رہے اور چند سال پہلے وہ لوگ گلشن اقبال سے شفٹ ہو کر کشمیر روڈ کے ایک عالی شان بنگلے میں چلے گئے تھے، تاہم نورین اور نگہت کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ان کی فون پر تو بات ہوتی ہی رہتی تھی، علاوہ ازیں ایک دوسرے کے گھر میں بھی آنا جانا رہتا تھا۔ لیکن آج تک وہ لوگ اس راز سے واقف نہیں ہو سکے کہ فیصل میری مرحوم بہن زبیدہ کا بیٹا ہے اور یہ کہ...... ہم اس کے سگے ماں باپ نہیں ہیں۔“

”یہ معاملہ بڑا پیچ دار ہو گیا ہے، کریم بھائی!“ میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ”اور جہاں تک میں آپ کے مسئلے اور پریشانی کو سمجھ پایا ہوں، میرے خیال میں، آپ نے فیصل کو بھی حقائق سے بے خبر رکھا ہوا ہے؟“

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے، وکیل صاحب!“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تبھی تو وہ نینی کے ورغلانے میں آسانی سے آ رہا ہے۔ وہ فیصل کو ہمارے خلاف بھڑکا رہی ہے۔“

”اور آپ کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ نینی محض ایک مہرہ ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نینی کی ڈوریاں کسی عبدالصمد نامی شخص کے ہاتھ میں ہیں، جو اپنی مرضی سے اسے اشاروں پر نچا رہا ہے؟“

”بالکل یہی بات ہے۔“ وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ”سارا فساد اسی مردود کا پیدا کیا ہوا ہے۔“

”اس مردود کی آپ سے کیا دشمنی ہے؟“ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

”کاروباری رقابت۔“ وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ”وہ شیطان میری ترقی سے جلتا ہے، لیکن اب تو وہ ترقی بھی برقرار نہیں رہی۔“

وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، ایک افسردہ سی سانس خارج کی اور بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”نورین کی بیماری کے حوالے سے تو میں بڑے مشکل حالات میں ہوں، وکیل صاحب! پیسہ تو خرچ ہو ہی رہا ہے، اس کے علاوہ جو ذہنی اذیت ہے، وہ بیان سے باہر

ہے۔ اور اب یہ فیصل والا نیا ایشو اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ حالانکہ میں نے کبھی صمد کے خلاف سوچا بھی نہیں۔ لیکن اس منحوس کو مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ وہ مجھے ہر طرف سے تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔"

"کریم بھائی!" اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ "دو افراد میں کاروباری مسابقت یا بزنس جیلسی ہوسکتی ہے، میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ آپ کے دل میں عبدالصمد اور اس کے کاروبار کے حوالے سے کوئی منفی جذبہ نہیں، خون جلانے والے سارے معاملات صمد ہی کی طرف سے ہیں، لیکن.......!" میں سانس ہموار کرنے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ عبدالصمد کو آپ کے خفیہ راز کی خبر کیسے ہوگئی؟ وہ کیسے یہ حقیقت جانتا ہے کہ فیصل آپ کی حقیقی اولاد نہیں؟"

"میں نے آپ کو بتایا ہے نا......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "آٹو اسپیئر پارٹس مارکیٹ میں ایک ایسے آدمی سے میری ملاقات ہوئی تھی، جو زبیدہ کی سسرال سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ فیصل کے والدِ حقیقی ادریس کا دُور پار کا رشتے دار ہے۔ اس حوالے سے ظاہر ہے، وہ فیصل کے گود لئے جانے والی حقیقت سے بھی واقف ہے۔ لیکن میں نے چونکہ کبھی اس سلسلے میں کوئی مشکوک حرکت نہیں کی تھی، لہٰذا میں مطمئن تھا۔ مگر......"

"اگر میں غلط نہیں سمجھ رہا تو......" میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "آپ جس شخص کا ذکر کر رہے ہیں، وہ عبدالصمد کے سوا کوئی دوسرا نہیں؟"

"جی، بالکل۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کریم بھائی! میری نظر میں صورتِ حال کچھ اس طرح بنتی ہے۔ عبدالصمد کسی بھی وجہ سے آپ کا دشمن ہے اور وہ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری سے بھی آگاہ ہے، یعنی وہ جانتا ہے کہ فیصل آپ کی سگی اولاد نہیں۔ نہ صرف وہ اس خطرناک حقیقت سے آشنا ہے، بلکہ آپ کو نقصان پہنچانے کے لئے وہ ان دنوں آپ کی اسی کمزوری سے کھیل بھی رہا ہے اور ضرورت پڑنے پر وہ یہ ثابت بھی کرسکتا ہے کہ آپ نے فیصل کو

اڈاپٹ کیا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ فیصل کے مرحوم باپ ہی کے خاندان کا ایک فرد ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟"

"نہیں، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ پریشانی بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے مزید کہا۔ "اور آپ کی مشکل یہ ہے کہ آپ نے فیصل کو حقیقت سے بے خبر رکھا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں، فیصل کی منگیتر رخسانہ اور اس کے گھر والے بھی نہیں جانتے کہ آپ فیصل کے حقیقی والدین نہیں ہیں۔ اس لئے آپ چاروں طرف سے مصیبت میں گھر گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں جادو کی چھڑی گھما کر سب ٹھیک کر دوں!"

"میں نے جادو کی چھڑی کے بارے میں تو نہیں سوچا، البتہ یہ اُمید ضرور ہے کہ اگر آپ اس معاملے میں کود پڑے تو اس کا کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اور وہ حل میری موافقت ہی میں ہوگا۔ میں نہ تو کسی قیمت پر فیصل کو کھونا چاہتا ہوں اور نہ ہی مجھے یہ منظور ہے کہ نورین کو کوئی صدمہ پہنچے۔ آپ کسی بھی طرح دماغ کو لڑائیں، قانونی داؤ پیچ آزمائیں یا سیاست و مصلحت کا استعمال کریں، لیکن میرا کام ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں جتنی بھی رقم خرچ ہو، میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا۔

"فیصل کے برتھ سرٹیفکیٹ اور تعلیمی اسناد وغیرہ میں، اس کی ولدیت کے خانے میں کس کا نام لکھا ہوا ہے؟"

"میرا......" کریم بھائی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "برتھ سرٹیفکیٹ تو میں نے اپنی ضرورت اور مرضی کے عین مطابق، ابتدا ہی میں کوشش کر کے ایسا بنوا لیا تھا کہ آئندہ زندگی میں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ زبیدہ کا کوئی سسرالی رشتے دار یوں اچانک گڑے مُردے اُکھاڑنے پر تُل جائے گا۔ میں نے ایسی دشمنی کے بارے میں تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

"انسان پر جب کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے یا کوئی مشکل وقت آتا ہے تو پھر سب کچھ وہی ہونے لگتا ہے، جس کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "بہرحال، اس وقت آپ کا مسئلہ اہم ہے۔ اور یہ اسی

وقت حل ہو سکتا ہے، جب عبدالصمد کا عمل دخل نہ رہے اور وہ بندہ بری طرح آپ کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔"

میں لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا تو وہ اُمید بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اگرچہ یہ معاملہ خاصا گنجلک اور پھنسا ہوا ہے، لیکن کچھ کرتا ہوں۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔ "آپ نے کچھ کرنے کی ہامی بھری ہے تو مجھے یقین ہو چلا ہے کہ آپ میری پریشانی ضرور دور کریں گے۔"

"لیکن اس کام کے لئے آپ کو مجھ سے بھرپور تعاون کرنا ہوگا!"

"میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں، وکیل صاحب!" وہ فرمانبرداری سے بولا۔

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔

"پہلے تو مجھے عبدالصمد اور نینی کے بارے میں مکمل معلومات چاہئیں........ ہر نوعیت کی معلومات!"

"ٹھیک ہے، آپ جو کچھ بھی جاننا چاہیں گے، میں آپ کو بتا دوں گا۔" وہ سنجیدہ لہجے میں بولا، پھر پوچھا۔ "کیا آپ فیصل کو ٹچ نہیں کریں گے؟"

"فی الحال فیصل، رخسانہ یا اس کے والدین کو ٹچ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "پہلے زہریلے سانپ عبدالصمد اور اس کے ڈنک نینی کو گھیرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی کسی اور رخ کی طرف دیکھیں گے۔"

پھر میرے استفسار پر کریم بھائی نے مطلوبہ معلومات مجھے فراہم کر دیں۔ میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ آپ دو تین روز کے لئے مجھے ایک ایسا آدمی دیں گے، جسے عبدالصمد اور نینی نہ جانتے ہوں۔ میں مذکورہ شخص کے ذریعے چند ایسی اہم معلومات اکٹھا کرنا چاہتا ہوں، جو مضبوط منصوبہ بندی کے کام آئیں گی۔"

"ٹھیک ہے، جناب! میں کل ہی آپ کا مطلوبہ بندہ آپ کے حوالے کر دوں گا۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ خاصا چلتا پُرزہ قسم کا لڑکا ہے۔"

"مجھے کسی ایسے ہی پھرتیلے اور ہوشیار لڑکے کی ضرورت ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"آپ کے ذہن میں کیا ہے؟" کریم بھائی نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"مجھے کچھ نہیں بتائیں گے؟"

"فی الحال تو میرے ذہن میں کچھ بھی واضح نہیں ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا فراہم کیا ہوا بندہ مجھے جو رپورٹ دے گا، میں اس کی روشنی میں آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کروں گا۔"

میں نے تھوڑا توقف کیا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"کریم بھائی! آپ ایک ہفتے کے بعد میرے پاس آ جائیں، جب تک میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا اور آپ کو واضح طور پر بتا دوں گا کہ کس انداز میں پیش قدمی کر کے ہم یہ جنگ جیت سکتے ہیں۔"

"اور اس دوران میں اگر فیصل نے کوئی مسئلہ کھڑا کر دیا تو........؟"

"آپ اس پر سے توجہ ہٹا لیں۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے قوی اُمید ہے کہ فیصل ان دنوں جس کام میں "مگن" ہے، اگر اسے چھیڑا نہ جائے تو وہ کسی مسئلے کو اُٹھانے، بٹھانے یا لٹانے کے بارے میں نہیں سوچے گا اور اس دوران میں، میں اس مسئلے کو جڑ سے اُکھاڑنے کا بندوبست کر لوں گا۔"

وہ مطمئن ہو کر میرے آفس سے رخصت ہو گیا۔

آئندہ روز وہ ایک پچیس چھبیس سالہ دراز قامت لڑکے کو لے کر میرے پاس آ گیا۔ اس دُبلے پتلے اور لمبوترے چہرے والے لڑکے کا نام عامر تھا۔ کریم بھائی نے مجھے بتایا کہ عامر اس کے لئے قابلِ بھروسا ہے۔ میں بے فکر ہو کر عامر سے کوئی بھی کام لے سکتا ہوں۔

عامر کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ واقعی کام کا بندہ ہے!

●......●......●

کریم بھائی ایک مرتبہ پھر میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے ایک ہفتے کے بعد اپنے پاس بلایا تھا اور اس سلسلے میں اس نے دن اور وقت کی بھرپور پابندی کی تھی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

”جی کریم بھائی! فیصل کا کیا حال ہے؟ اس نے پچھلے سات دنوں میں آپ کے لئے کوئی نئی پریشانی تو پیدا نہیں کی؟“

ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ”سب سے پہلے آپ مجھے اپنی بیوی کی خیر خیریت سے آگاہ کریں گے۔“

”نورین کی کیفیت کم و بیش ویسی ہی ہے، جیسی کہ میں نے پچھلی ملاقات میں آپ کو بتائی تھی۔“ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اور جہاں تک فیصل کا تعلق ہے تو میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا ہے اور نتائج سو فیصد ہیں....... میں نے اس کے کسی معاملے میں ٹانگ نہیں اڑائی اور وہ آپ کی پیش گوئی کے مطابق، نینی کے ساتھ مصروف ہے۔“

”ویری گڈ.......!“ میں نے اطمینان سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آئندہ بھی اگر آپ میری نصیحت پر اسی طرح عمل کرتے رہیں گے تو ان شاء اللہ! نتائج حوصلہ افزا ہی برآمد ہوں گے۔“

”جی، ضرور....... ضرور۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا، پھر پوچھنے لگا۔ ”پچھلے ایک ہفتے میں آپ کی طرف کیا پراگریس رہی ہے؟“

”آپ نے مجھے جو بندہ دیا تھا، اس نے میری معلومات اور ضرورت کے مطابق، معلومات مجھے فراہم کر دی ہیں۔ اور میں نے دو دن پہلے عامر کو فارغ کر دیا ہے۔“

میں نے اس کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”اس جاسوسانہ تحقیق کی روشنی میں آپ کا دشمن عبدالصمد ایک انتہائی کمینہ اور سفاک شخص ثابت ہوا ہے اور اس کا مہرہ یعنی نین تارہ عرف نینی کسی فتنہ پرور چالاک لومڑی سے کم دکھائی نہیں دیتی۔ میں نے ان دونوں کرداروں کی چند اہم کمزوریوں کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا ہے۔“

”عبدالصمد کی فطرت اور نینی کی چال بازی مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔“ کریم بھائی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور آپ بھی اپنی تحقیق کے نتیجے میں اسی حقیقت تک پہنچے ہیں۔ لیکن میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ نے آئندہ کے لئے کیا پروگرام ترتیب دیا ہے؟ کون سی حکمت عملی ہمیں یقینی کامیابی دلا سکتی ہے؟“

”حکمت عملی میں نے تیار کر لی ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس پلاننگ کے تین حصے ہیں۔ دو شریفانہ اور تیسرا قدرے بدمعاشانہ....... پہلے دو حصوں پر آپ عمل کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ اسی سے کام بن جائے گا، تیسرے طریقے کے استعمال کی نوبت نہیں آئے گی۔ اور اگر میرے اندازے کے مطابق.......“

میں لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”پہلے دونوں شریفانہ طریقے کارآمد ثابت نہ ہو سکے تو پھر میں بہ نفسِ نفیس میدان میں اُتروں گا اور تیسرا طریقہ آزماتے ہوئے آپ کے دشمنوں کو چاروں خانے چت کر دوں گا۔“

”وکیل صاحب! آپ کی وکالت اپنی جگہ، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ ایک دلچسپ انسان ہیں۔“ وہ ستائشی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کہیں سے بھی غنڈے یا بدمعاش نظر نہیں آتے۔ لیکن کتنی آسانی سے آپ نے کہا کہ اگر پہلے دو طریقے ناکامیاب رہے تو آپ بدمعاشانہ طریقہ اختیار کر کے دشمنوں کو ہرا دیں گے۔“

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے، کریم بھائی!“ میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ”میں واقعی کوئی غنڈا بدمعاش نہیں ہوں۔ یہ الفاظ میں نے محاورتاً استعمال کئے ہیں۔ ان سے یہاں میری مراد یہ ہے کہ میں دشمن کی چال انہی پر لوٹا دوں گا۔ جس طرح لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے، بالکل اسی طرح مکار اور چال باز دشمن کو چت کرنے کے لئے مکاری اور چال بازی کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے....... آپ اسے غنڈہ گردی یا بدمعاشی بھی کہہ سکتے ہیں۔“

”اچھی طرح سمجھ گیا، جناب!“ کریم بھائی نے سر کو اثباتی جنبش دی، پھر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”بتائیں جی، میرے ذمے کون سے دو شریفانہ طریقے ہیں؟“

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”کریم بھائی! پوری سچائی اور ایمانداری سے ایک بات بتائیں....... ذرا سا بھی جھوٹ یا مصلحت نہیں چلے گی۔“

”جی پوچھیں، میں سچ بولنے سے کبھی نہیں ڈرتا۔“ وہ اٹل لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔

”آپ فیصل اور رخسانہ کی شادی محض اپنی بیمار بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لئے کرنا چاہتے ہیں یا اس رشتے کے پیچھے کچھ کاروباری مقاصد بھی ہیں؟“

”خدا گواہ ہے کہ میں یہ شادی صرف نورین کی تمنا پوری کرنے کے لئے کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں لالچی ہوں اور نہ ہی اس شادی سے جڑا ہوا میرا کوئی کاروباری مقصد ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اگر اس شادی میں کوئی رخنہ پڑا تو نورین کو......“ وہ بولتے بولتے معنی خیز انداز میں خاموش ہو گیا۔

میں اس کے جذبات اور احساسات کو سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس سے آگے اور کیا کہہ سکتا تھا۔ میں نے دوستانہ انداز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”کریم بھائی! آپ کی بات سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اگر نورین کو پہنچنے والے ذہنی اور جذباتی صدمے کا معاملہ نہ ہو تو آپ اس رشتے کے لئے اصراری نہیں ہیں؟“

”جی ہاں، بالکل۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ نورین اس بات پر کمپرومائز کر لے گی؟“

”یہ ایسے ممکن ہے......“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”کہ نورین کو بڑے منطقی اور نفسیاتی انداز میں اس کے لئے آمادہ کیا جائے گا۔“

”مگر کیسے؟“ وہ اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”نورین اتنا بڑا قدم اُٹھانے کے لئے کیونکر تیار ہو جائے گی؟“

”کریم بھائی! آپ کی مشکل کو حل کرنے کے لئے میں نے تین فارمولے واضح کیے ہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے، پہلے دونوں فارمولے شریفانہ ہیں اور وہ آپ کو آزمانا ہیں۔ پہلے ”شریف فارمولے“ کے بھی دو حصے ہیں، جن میں سے ایک کا تعلق نورین سے ہے اور دوسرے کا واسطہ رخسانہ کے والدین سے ہے......تو پہلے میں، پہلے فارمولے کے پہلے حصے کی طرف آتا ہوں۔“

میں سانس ہموار کرنے کے لئے لحہ بھر کو متوقف ہوا تو کریم بھائی کو گہری سنجیدگی سے اپنی جانب متوجہ پایا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن اور حیرانی کے ملے جلے تاثرات

تھے۔ میں نے گمبھیر آواز میں بولنا شروع کیا۔ میرا انداز کسی ایسے پروفیسر جیسا تھا، جو نفسیات پڑھانے پر مامور ہو۔

”کریم بھائی! جو شخص قدم قدم موت کی جانب بڑھ رہا ہو اور اسے یقین ہو جائے کہ دنیا میں اس کی زندگی بہت تھوڑی رہ گئی ہے تو اس کے اندر قدرتی طور پر حقیقت پسندی کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ معمولی سے معمولی جھوٹ کو بھی گناہِ کبیرہ تصور کرنے لگتا ہے۔ نہ صرف تصور کرنے لگتا ہے بلکہ خود بھی جھوٹ بولنے کی غلطی نہیں کرتا اور اگر پچھلی زندگی میں اس سے ایسی کوئی کوتاہی ہو چکی ہو تو وہ اس کی تلافی اور کفارے کی فکر میں رہتا ہے۔ یہ ایک فطری اور قدرتی روّیہ ہے، جس میں کوئی دوسری رائے یا اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔“

میں نے ایک مرتبہ پھر چند سیکنڈ کا توقف کیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کریم بھائی! آپ آج کسی وقت تنہائی میں اپنی بیوی کو یہ باور کرانے کی کوشش کریں کہ آپ لوگوں نے فیصل کی ولدیت کے حوالے سے، سلیم اینڈ مسز سلیم سے جو غلط بیانی کر رکھی ہے، اس کا بھانڈا مستقبل قریب میں کسی بھی وقت پھوٹ سکتا ہے۔ اور اگر یہ ”کام“ نورین کی موت کے بعد ہوا تو اس کی دوست نگہت سلیم کا دل اس کی طرف سے کھٹا ہو جائے گا۔ جب نگہت کو یہ پتہ چلے گا کہ جس لڑکے کو اس نے اپنی دوست کا بیٹا سمجھ کر داماد کا درجہ دیا ہے، وہ کسی اور ہی کی اولاد ہے تو وہ نورین کے بارے میں لامحالہ منفی انداز میں سوچنے پر مجبور ہو جائے گی۔ جس کے نتیجے میں دونوں خاندانوں میں تو جو فتنہ پھیلے گا، سو پھیلے گا ہی، اس کے ساتھ ہی نورین کی روح بھی ایک عجیب اذیت کا شکار ہو جائے گی۔ ضمیر کی یہ خلش اسے مرنے کے بعد بھی چین سے نہیں رہنے دے گی۔ زندگی میں تو موذی کینسر نے حد سے زیادہ تکلیف پہنچائی ہی تھی، لیکن فیصل والا معاملہ اسے روزِ حشر تک دردناک عذاب میں مبتلا رکھے گا۔ لہٰذا انسانیت اور عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ رخسانہ کے والدین کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا جائے!“

میں خاموش ہوا تو کریم بھائی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نورین سے اس کی موت کی باتیں کرنا اگرچہ میرے بس کی بات تو نہیں، لیکن دل پر بھاری پتھر رکھ کر میں آپ کی ہدایت کے مطابق ایسا کرلوں گا اور جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں...... مجھے امید ہے، نورین حقیقت کی اس نقاب کشائی کے لئے بھی تیار ہو جائے گی۔ لیکن یہ تو بتائیں کہ اس کا فائدہ کیا ہوگا؟"

"اس کا سارا فائدہ آنے والے دنوں میں فیصل اور رخسانہ کو ہوگا۔" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "وہ دونوں زیادہ اعتماد اور محبت سے اپنی رفیقانہ زندگی کا آغاز کر سکیں گے۔ اور آپ دونوں کی طرح زندگی کی آخری سانس تک ایک دوسرے کا ساتھ نبھائیں گے۔"

"آپ کی بات سمجھ میں آ رہی ہے، وکیل صاحب!" وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ "لیکن اتنا کرنے سے کام نہیں بنے گا۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ صرف اتنا ہی کرنا ہے؟" میں نے جلدی سے کہا۔ "یہ تو ابتدائی مرحلہ ہے، آگے آگے دیکھیں، کیا ہوتا ہے؟"

"فرض کریں، جیسا کہ آپ کی طرح مجھے بھی یقین ہے کہ نورین سچائی کے اظہار کے لئے آمادہ ہو جائے گی۔" کریم بھائی نے بدستور سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن اس بارے میں وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس انکشاف کے بعد سلیم اور نگہت بھی اس رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے تیار ہوں گے یا نہیں؟"

"مسٹر اینڈ مسز سلیم کا فیصلہ زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ان کے پاس صرف دو ہی آپشن ہیں...... انکار یا اقرار۔ اگر وہ اس رشتے کو برقرار رکھتے ہیں تو فبہا...... اور اگر رشتہ ختم کر دیتے ہیں تو آپ کو کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے۔"

"مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا، لیکن نورین......؟"

"نورین حقیقت بیانی کے بعد اتنی ریلیکس ہو جائے گی کہ اس رشتے کے ٹوٹنے سے اسے کسی قسم کا ذہنی یا قلبی صدمہ نہیں پہنچے گا۔" کریم بھائی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے کہہ دیا۔ "ہاں، البتہ ہلکا پھلکا افسوس ہو سکتا ہے...... اس بات کا افسوس کہ فیصل کی رخسانہ سے شادی نہ ہو سکی اور...... اس بات کا افسوس کہ اس کی

دوست نگہت سلیم کو حقیقت بیانی پسند کیوں نہیں آئی۔"

"ہوں......" وہ میرے خیالات سے متفق دکھائی دینے لگا، گہری سنجیدگی سے بولا۔ "ٹھیک ہے، فرض کریں کہ میں نے نورین کو سچ بیانی کے لئے تیار کر لیا۔ آگے بتائیں، کیا کرنا ہے؟"

"اگر نورین آپ کی بات مان لیتی ہے تو سمجھیں کہ پہلے فارمولے کا پہلا حصہ مکمل ہو گیا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اس کے بعد اسی فارمولے کے دوسرے حصے پر عمل کرنا ہوگا اور وہ کچھ اس طرح ہے۔" میں لمحے بھر کو تھما، پھر اسی سنجیدگی سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دوسرے حصے کے مطابق، فیصل کی حقیقت نورین کی زبانی نگہت تک اور نگہت کی زبانی اس کے شوہر سلیم تک پہنچے گی۔ اور مجھے یقین ہے، ایک دو روز ہی میں اس پیش رفت کے نتائج بھی برآمد ہو جائیں گے۔"

"ہاں یا نہ......" وہ جلدی سے بولا۔

"بالکل!" میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور مزید کہا۔ "ان دو دنوں کے دوران میں آپ دوسرے فارمولے کے پہلے حصے پر عمل شروع کر دیں گے۔"

"کیا دوسرے فارمولے کے بھی ایک سے زیادہ حصے ہیں؟" وہ تعجب خیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں!" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے بڑی محنت اور احتیاط سے جنگ کا یہ نقشہ ترتیب دیا ہے۔ میں نے اس بساط پر مہرے کچھ اس انداز میں سجائے ہیں کہ کوئی جنگی جرنیل بھی دیکھے تو عش عش کر اُٹھے۔" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ضروری نہیں کہ ہر کیس کو عدالت میں ہی لے جا کر حل کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی دولت اور وقت کم سے کم خرچ ہو اور اس کے ساتھ ہی آپ کی عزت اور نیک نامی پر بھی کوئی حرف نہ آئے۔"

"بہت بہت شکریہ، وکیل صاحب!" وہ تشکر آمیز لہجے میں بولا۔ "میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ آپ دوسرے حصے یعنی دوسرے فارمولے کی تفصیلات بیان

فرمائیں۔"

میں اسے بتانے لگا۔ "پہلے فارمولے کی طرح دوسرے فارمولے کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں، یعنی انہی دو دنوں کے دوران میں آپ کسی وقت فیصل کو لے کر بیٹھیں گے، اس سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے۔ لیکن جو بھی سچ اسے بتائیں گے، وہ آپ کے زاویے سے ہوگا۔ تاکہ فیصل پر آپ کی گرفت قائم رہے۔ اس سلسلے میں، مصلحت کے تقاضے کو نبھاتے ہوئے تھوڑی غلط بیانی بھی کرنا ہوگی۔ لیکن اس کا کوئی منفی مقصد نہیں ہوگا، جیسا کہ......" میں لمحے بھر کے لئے رکا، ایک گہری سانس خارج کی، پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مثلاً........ آپ اسے بتا سکتے ہیں کہ کن حالات میں آپ نے اسے اڈاپٹ کیا تھا۔ اس کے حقیقی والدین ایک ایکسیڈنٹ میں مارے گئے تھے، لہٰذا اس کے لئے دنیا میں اس گھر سے زیادہ محفوظ اور موزوں ٹھکانا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ آپ یہاں وقت کی ضرورت کے تحت عبدالصمد کا کارڈ بھی کھیل سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے صاحب؟" وہ متاملانہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے بتایا۔ "اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ عبدالصمد آپ کا کھلا دشمن ہے۔ وہ نینی کے ذریعے جو کھیل، کھیل رہا ہے وہ اس کی کمینگی، کم ظرفی اور ذلالت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ لہٰذا اگر آپ اس بندے کی مکاری کے جواب میں مکاری اور جھوٹ کے جواب میں تھوڑا جھوٹ بولیں گے تو "محبت اور جنگ میں ہر حربہ جائز" کے مصداق یہ کچھ زیادہ غلط نہیں ہوگا۔ آپ عبدالصمد کو نہایت ہی غلیظ انداز میں فیصل کے سامنے پیش کریں گے۔"

اس بار جو میں متوقف ہوا تو کریم بھائی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات کو جاری رکھا۔

"آپ فیصل کو سمجھائیں کہ عبدالصمد اس کے حقیقی باپ ادریس کا دُور پار کا رشتے دار ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ یہاں پر ہوشیاری دکھاتے ہوئے فیصل کو یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ عبدالصمد دراصل اس کے باپ ادریس کا دیرینہ دشمن تھا اور وہ حادثہ بھی عبدالصمد ہی کا کیا دھرا تھا، جس میں فیصل کے سگے والدین کو موت کا مزہ

چکھنا پڑا۔ درحقیقت عبدالصمد ہی اس کے والدین کا قاتل ہے۔ اس وقت فیصل کی جان کو بہت زیادہ خطرہ تھا، لہٰذا آپ اور نورین نے اسے گود لے لیا اور علاقہ بدل کر اس کے دشمن کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ آپ نے فیصل کے برتھ سرٹیفکیٹ میں، ولدیت کے خانے میں اسی احتیاط کے پیش نظر اپنا نام لکھوایا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے۔ ایک ماموں اور ممانی اس سے زیادہ اور کیا قربانی دے سکتے ہیں؟"

"آپ کا ذہن کیسے خطرناک انداز میں چلتا ہے، وکیل صاحب!" وہ متعجب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کی سکھائی ہوئی باتوں میں اگرچہ کئی مقامات پر غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے، لیکن یہ مصلحت کے اصولوں پر پوری اُترتی ہیں۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس کے بعد آپ اپنی توپوں کا رخ نین تارا عرف نینی کی طرف موڑ دیں گے۔ آپ نینی کو غلط لڑکی اور عبدالصمد کی ایجنٹ ثابت کرنے کے لئے جو کچھ بھی کہنا چاہیں، کہہ سکتے ہیں۔ آپ فیصل کو بتائیں گے کہ عبدالصمد کئی سال کے تعاقب کے بعد بالآخر ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ وہ آپ کا کاروباری حریف بھی ہے اور فیصل کا دشمن بھی۔ نینی کچھ عرصہ پہلے اسی کے پاس کام کرتی تھی۔ عبدالصمد کے اشارے پر نینی نے فیصل والے آفس میں جاب حاصل کی ہے، تاکہ اگر ایک طرف عبدالصمد آپ کو کاروباری طور پر نقصان پہنچائے تو دوسری جانب نینی اس کے منصوبے کے مطابق، فیصل کو محبت اور عشق کے جال میں پھنسا کر اس کی توجہ رخسار پر سے ہٹا دے۔ آپ فیصل کو یہ بھی بتائیں کہ عبدالصمد کو نورین کی بیماری کا پوری طرح علم ہے۔ وہ رخسانہ والے رشتے کو خراب کر کے فیصل کی ممانی کو ٹارچر کرنا چاہتا ہے۔ ابھی تک صمد کو اس کے منصوبے میں پوری طرح کامیابی حاصل ہے۔ کیونکہ فیصل، نینی کی محبت کو اصلی سمجھ کر اس کا دیوانہ بنا بیٹھا ہے، جبکہ وہ لڑکی محض ایک ڈرامے کا کردار ہے۔ اسے فیصل سے محبت تو کجا، ذرا سی بھی ہمدردی نہیں........ ادھر رشتہ ٹوٹنے سے نورین کو جان لیوا صدمہ پہنچا، ادھر نینی فیصل کو "بائے بائے" کہہ دے گی۔ کیونکہ اسکرپٹ کے مطابق، اس کا کردار بس اتنا سا ہی ہے۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کریم بھائی سے پوچھا۔

"عبدالصمد کی دشمنی اور نینی کی مکاری کے حوالے سے اگر میں نے کچھ غلط کہا ہو تو آپ مجھے بتائیں؟"

"نہیں......" اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکی اور بولا۔ "آپ نے عبدالصمد اور نینی کے کردار کا بالکل درست تجزیہ کیا ہے۔ وہ دونوں اسی قماش کے لوگ ہیں۔ لیکن آپ فیصل کی موجودہ ذہنی و قلبی کیفیت کو بھی نظر میں رکھیں۔ وہ بری طرح نینی کی فراڈ محبت کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ عبدالصمد کے خلاف تو شاید سن لے، لیکن نینی کے حوالے سے اس کی برین واشنگ یقیناً مشکل ہوگی۔ عشق کا بھوت اتنی آسانی سے نہیں اُترا کرتا، وکیل صاحب!"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کریم بھائی! میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ بھوت کی دو اقسام ہیں۔ نمبر ایک، لاتوں کے بھوت، نمبر دو، باتوں کے بھوت۔ میں نے دوسرے فارمولے کو بھی دو حصوں میں اس لئے رکھا ہے کہ ایک حصے میں باتوں سے کام لیا جائے گا اور دوسرے حصے میں لاتوں سے......" میں تھوڑی دیر کے لئے رکا، گہری نظر سے کریم بھائی کے چہرے پر اُبھرنے والے تاثرات کا جائزہ لیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کریم بھائی! آپ فیصل کو عبدالصمد اور نینی کے حوالے سے جو کچھ بھی بتائیں گے، وہ باتوں کے بھوت کا "ٹریٹمنٹ" ہے۔ اگر آپ کی بات فیصل کی سمجھ میں نہ آئی تو پھر لاتوں کے بھوت والا "ٹریٹمنٹ" آزمانا ہوگا۔"

وہ بڑی فکرمندی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تو کیا آپ فیصل کی پٹائی وغیرہ کی بات کر رہے ہیں؟"

"فیصل کے دل اور دماغ پر نینی کے عشق کا بھوت سوار ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ہے کہ نہیں؟"

"بالکل ہے، وکیل صاحب!" وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اسی وجہ سے تو ساری خرابی پیدا ہوئی ہے۔"

"اگر خرابی پیدا ہوئی ہے تو اسے ہم دور کرنے کی تگ و دو ہی میں تو لگے ہوئے ہیں، کریم بھائی!" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "نینی کے سرابی عشق کی تپش فیصل

کے دماغ کو چڑھی ہوئی ہے۔ وہ اس وقت اونچے درجے کے بخار میں مبتلا ہے۔ اس کا بخار اتارنے کے لئے "برف کی پٹیاں" رکھنا پڑیں گی۔ آپ اس کو یقین دلائیں گے کہ نینی سنجیدہ نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ایک ناٹک کر رہی ہے۔"

"لیکن میں فیصل کو یہ یقین کیسے دلا سکوں گا؟" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ فیصل کو بتائیں گے کہ آپ نینی کی محبت کو کھوکھلا اور جھوٹا ثابت کر سکتے ہیں اور یہی دوسرے فارمولے کا دوسرا حصہ ہوگا۔"

"بات تو پھر وہی ہے وکیل صاحب!" وہ ٹکٹکی نظروں سے مجھے تکنے لگا۔ "میں فیصل کی نگاہ میں نینی کو کس طرح گرا سکتا ہوں، اسے کیسے فرڈ ثابت کر سکتا ہوں؟"

"اس کا طریقہ میں آپ کو بتاؤں گا۔" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "لیکن اس وقت جب آپ ڈیڑھ فارمولے (ون + ہاف) کو آزما کر ان کے نتائج کے ساتھ میرے پاس آئیں گے اور......میرا خیال ہے، آنے والے دو تین روز میں یہ کام باآسانی ہو جائے گا؟"

وہ معنی خیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

"اس کا مطلب ہے، وکیل صاحب! آپ کے ہاتھ میں نینی کی کوئی ایسی کمزوری آ گئی ہے، جس کی بنا پر اس کی مکاری اور عیاری کو فیصل کی نظر میں کھولا جا سکتا ہے؟"

"آپ کا اندازہ صد فی صد درست ہے، کریم بھائی!" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں بتائیں گے؟" وہ شاکی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"ابھی نہیں۔" میں نے کسی سخت گیر ٹیچر کے مانند کہا۔ "پہلے آپ وہ ہوم ورک مکمل کریں، جو میں نے آج آپ کو دیا ہے۔ نیا لیسن اس کے بعد ملے گا۔"

وہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتا چلا گیا۔

میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "کریم بھائی! آپ کے فراہم کردہ بندے عامر سے میں نے بھاگ دوڑ کا موٹا موٹا کام لیا ہے۔ باریک اور نازک، کام کے لئے میں نے اپنے جسم اور ذہن کو زحمت دی ہے۔ میں نے نہ صرف عبدالصمد کو واچ کیا ہے، بلکہ

نینی کے محلے کے ایک دو چکر لگائے ہیں، جس کے نتیجے میں بعض اہم انکشافات ہوئے ہیں۔ لیکن معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ ابھی میں آپ کو........''

''سمجھ گیا........ میں بالکل سمجھ گیا۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ بے فکر رہیں، وکیل صاحب!........ اب میں آپ سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔''

تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

●......●......●

منظر اسی دفتر کا تھا اور میرے سامنے کریم بھائی بیٹھا ہوا تھا!

پہلے میں نے اس کی کارگزاری سننا چاہی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں اصل موضوع پر آ گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

''جی کریم بھائی! کیا تیر مار کر آ رہے ہیں آپ؟''

''جو تیر آپ نے دیئے تھے، وہ سارے چلا دیئے ہیں۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔ پھر اس کا لہجہ قدرے افسردہ ہو گیا۔ ''مگر معاملہ آخر میں آ کر اُلجھ گیا ہے۔ وہی ہوا، جس کا مجھے خدشہ تھا۔ فیصل یہ ماننے کو تیار نہیں کہ نینی اس سے فریب کر رہی ہے۔''

میں نے اپنی تسلی کی خاطر پوچھ لیا۔

''باقی مراحل تو سب ٹھیک رہے ہیں نا؟''

وہ وضاحت سے بتانے لگا۔

''وکیل صاحب! میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق نورین سے بات کی اور وہ مان گئی۔ دوسری جانب جب سلیم اور نگہت کو فیصل کی حقیقت کا پتہ چلا تو انہوں نے بھی کوئی مسئلہ کھڑا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ لوگ عملی اور حقیقت پسند ہیں، اس لئے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ مگر فیصل مطمئن نہیں۔ اس نے مجھ سے یہ بھی پوچھا تھا کہ اسے اس بات سے بے خبر کیوں رکھا گیا کہ وہ ہماری سگی اولاد نہیں۔ میں نے اس موقع پر نورین کا کارڈ کھیلا اور اسے بتایا کہ نورین نے مجھے اس راز کو راز رکھنے کے لئے قسم دے رکھی تھی۔ وہ چاہے تو جا کر اپنی ممانی سے پوچھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے، نورین کی حالت ایسی نہیں کہ وہ تصدیق کرتا پھرے، اس لئے بھی یہ بات نبھ گئی۔ مگر نینی والا معاملہ اس کی عقل میں نہیں آ رہا۔''

اس نے ذرا رک کر ایک تھکی ہوئی سانس خارج کی اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''اب آپ وہ فارمولا بتائیں، جس کا ذکر کیا تھا؟''

''ایفائے عہد کی بڑی اہمیت ہے، کریم بھائی!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اگر میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا تو اسے پورا بھی کروں گا۔ میری بات غور سے سنیں۔''

میں نے توقف کر کے پُراسرار نظروں سے اسے دیکھا تو وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''کریم بھائی! آج رات کو آپ پھر فیصل کے ساتھ کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھ جائیں اور اس سے کہیں کہ اگر وہ نینی کی محبت کی حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے تو ایک تجربہ کر کے دیکھ لے........''

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھا۔ اس سے اس کی بے تابی کا اندازہ ہوتا تھا۔ اضطراری لہجے میں وہ مجھ سے مستفسر ہوا۔

''کیسا تجربہ، وکیل صاحب؟''

''رشتہ لگانے کا تجربہ۔'' میں نے اٹل انداز میں کہا۔

''رشتہ لگانے کا تجربہ........؟'' وہ میرے ہی کہے ہوئے الفاظ کو دہراتے ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب! آپ کی بات بالکل سمجھ میں نہیں آئی؟''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''آپ فیصل سے کہیں کہ اگر اسے نینی کی محبت کا اتنا ہی یقین ہے تو وہ آپ کی موجودگی میں اسے فون کرے۔ اور اس کو بتائے کہ وہ اپنے والد بہ الفاظِ دیگر اپنے ماموں یعنی آپ کے ساتھ اس کے والدین سے ملنے آنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ بتائے کہ اس نیک کام کے لئے کون سا دن مناسب رہے گا۔''

میں نے تھوڑا توقف کر کے کریم بھائی کی کیفیت کا جائزہ لیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اگر فیصل واقعی اس کام کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور........ وہ آپ کی موجودگی

میں نینی کے گھر فون کر کے اس سے ایسا کوئی استفسار کرتا ہے تو وہ یقیناً اس کی آمد کا مقصد سمجھ جائے گی۔ فرض محال، اگر وہ بالکل ہی بدھو ہے اور فیصل کی بات کو نہیں سمجھ پاتی تو ایسی صورت میں وہ اس سے ضرور پوچھے گی کہ وہ اپنے ماموں یا والد کے ہمراہ اس کے والدین سے ملنے کیوں آ رہا ہے۔ ایسی صورت میں فیصل واضح الفاظ میں اسے بتا دے گا کہ وہ اس کے رشتے کی بات کرنے آ رہے ہیں۔“

”یہ تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی، جناب!“ وہ ایک مرتبہ پھر میری بات کاٹتے ہوئے متوحش لہجے میں بولا۔

”کیسی گڑبڑ؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ فکرمندی سے بولا۔

”اگر نینی نے اس بات کے لئے ہامی بھرتے ہوئے فیصل کو کوئی دن بتا دیا تو فیصل کا یقین اور بھی پختہ ہو جائے گا اور پھر مجھے فیصل کی شادی نینی سے کرنا ہو گی اور...... بنا بنایا کھیل تباہ ہو کر رہ جائے گا۔“

”ایسا کچھ نہیں ہو گا، کریم بھائی!“ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”میں نے سانپ کو آپ پر چھوڑنے سے پہلے اس کا سارا زہر نکال لیا ہے۔ اب اس کی حیثیت ایک حقیر کیچوے سے زیادہ کچھ نہیں۔ نینی کی کوئی چال کامیاب ہو سکے گی اور نہ ہی کوئی ڈھال مؤثر ثابت ہو گی۔ اللہ کا نام لے کر کود جائیں۔“

”گویا...... آپ کو یقین ہے۔“ وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کہ نینی اسے صاف منع کر دے گی؟“

”جی ہاں...... پکا یقین ہے۔“ میں نے چٹانی لہجے میں کہا۔

وہ متذبذب نظروں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مگر کیوں؟“

”اس لئے کہ وہ اپنے رشتے کے سلسلے میں کسی بھی پارٹی کو اپنے گھر بلانے کی حماقت نہیں کر سکتی“ میں نے بڑے واضح الفاظ میں کریم بھائی کو حقیقت سے آشنا کرتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ وہ آل ریڈی منگنی شدہ ہے۔“

”کک...... کیا......؟“ کریم بھائی کی آواز حیرت سے پھٹی جا رہی تھی۔

”جی ہاں کریم بھائی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وضاحت کر

دی۔ ”وہ اپنے خالہ زاد شکیل سے منسوب ہے، جو گرومندر کے علاقے میں واقع پارٹی ڈیکوریشن والوں کی ایک دکان پر کام کرتا ہے۔ میں شکیل سے کسی کام کے بہانے مل چکا ہوں۔ وہ مجھے نہیں جانتا اور نہ ہی میرے ارادوں سے واقف ہے۔ لیکن اگر......“

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اگر سیدھی انگلی سے گھی نکلتا نظر نہ آیا تو مجھے مجبوری میں اپنی انگلی کو ٹیڑھا کرنا پڑے گا۔ اگر میری ہنرمندی سے شکیل کو نینی اور فیصل کے کرتوتوں کا پتہ چل گیا تو وہ نینی کے ساتھ تو جو سلوک کرے گا، وہ کرے گا ہی، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ فیصل کی ڈھنائی بھی کر دے گا۔ یہی وہ تیسرا فارمولا ہے، جسے میں نے بدمعاشی کا نام دیا ہے۔“

میں نے ایک بار پھر توقف کیا اور مزید کہا۔

”مگر میں کوئی فتنہ گری نہیں چاہتا۔ اگر یہ کام آسانی اور سہولت سے ہو جاتا ہے تو فبہا...... بہ صورتِ دیگر ”مرتا کیا نہ کرتا“ کے مصداق کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا نا، کریم بھائی!“

”آپ جو بھی کریں، لیکن اس بات کا خاص طور پر خیال رکھیں کہ فیصل کا بال بھی بیکا نہ ہو۔“ وہ شفقت پدری سے مغلوب آواز میں بولا۔ ”اس کا دماغ خراب ہی سہی، لیکن وکیل صاحب! اس لڑکے میں میری یعنی، ہماری جان ہے۔“

”میں آپ کے جذبات اور فیصل سے محبت کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں، کریم بھائی!“ میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ اِن شاء اللہ! اس اقدام کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ مجھے امید ہے، شریفانہ طریقے ہی سے کام بن جائے گا۔“

”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے، وکیل صاحب!“ وہ دعائیہ انداز میں چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہم نے بڑی محبت، ناز و نعم اور دل داری سے فیصل کو پال پوس کر اتنا بڑا کیا ہے۔“ اس کی آواز بھرّا گئی۔ ”یہ سچ ہے کہ وہ ہماری حقیقی اولاد نہیں، لیکن ہم نے اسے سگی اولاد سے بھی زیادہ لاڈ پیار دیا ہے۔ ہم اسے کوئی تکلیف پہنچتے نہیں دیکھ سکتے۔ مجھے نورین کی بیماری نے توڑ کر رکھ دیا ہے، لیکن نینی والے معاملے نے جتنی ذہنی اذیت پہنچائی ہے، وہ بیان سے باہر ہے وکیل صاحب!“

”آپ بیان نہ کریں تو بھی میں محسوس کر سکتا ہوں، کریم بھائی......!“ میں نے

دوستانہ انداز میں کہا۔ ”نینی کا کانٹا نکالنے کے لئے میں نے آپ کو ترکیب بتا دی ہے۔ اِن شاء اللہ! کل جب آپ مجھ سے ملنے آئیں گے تو آپ کا چہرہ خوشی اور اطمینان سے تمتما رہا ہوگا!“

”اِن شاء اللہ! ایسا ہی ہوگا، وکیل صاحب!“ وہ دل کی گہرائیوں سے بولا۔

میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”کریم بھائی! کیا فیصل کو معلوم ہے کہ آپ ان دنوں مجھ سے یعنی کسی وکیل سے ملنے آتے ہیں؟“

”جی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”اس کے علاوہ اور کوئی جانتا ہے؟“

”قطعاً نہیں۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر گردن کو نفی میں جھٹکا اور بتایا۔ ”یہ معاملہ صرف ہم دونوں کے بیچ ہے۔ میں نے نورین سے بھی آپ کی مشاورت کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ، عامر کو یہ پتہ ہے کہ میں آپ کے پاس آتا ہوں۔“

”عامر غیر متعلق اور بے ضرر انسان ہے۔“ میں نے مطمئن انداز میں کہا۔ ”وہ کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرے گا۔ اس بے چارے کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں نے اس کے توسط اور تعاون سے جو معلومات اکٹھا کی ہیں، انہیں میں کس طور اور کس مقصد کے لئے استعمال کروں گا۔“

”تو پھر میں چلتا ہوں۔“ کریم بھائی نے اجازت طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، آپ جائیں۔ اور آج رات آپ فیصل سے فائنل میٹنگ کریں گے؟“

”جی بالکل......!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ”میں کل آپ کو اس میٹنگ کے نتائج سے آگاہ کروں گا۔“

”کریم بھائی!“ میں نے بے حد سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔ ”مجھے ننانوے فیصد امید ہے کہ رات والی ٹریٹمنٹ کے بعد فیصل کا دماغ ٹھکانے آ جائے گا اور نینی کی طرف سے اس کا دل کھٹا بلکہ میلا ہو جائے گا۔ باقی بچا ایک فیصد......!“ میں سانس

لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس ایک فیصد کا میں استعمال کروں گا اور یہ استعمال کل سے شروع ہوگا، آپ کی پیش کردہ رپورٹ کے بعد......اور مجھے یقین ہے، آئندہ چوبیس گھنٹے میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔“

●......●......●

میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ عدالت کا رخ کرنے سے پہلے میں تھوڑا وقت اپنے دفتر میں گزارتا ہوں۔ گھر سے تیار ہو کر میں سیدھا اپنے دفتر پہنچتا ہوں اور ضروری فائلوں سے ”ملاقات“ کے بعد میں عدالت کی طرف بڑھ جاتا ہوں۔

آئندہ روز جب میں دفتر سے نکل کر عدالت کی طرف بڑھ رہا تھا تو میں نے سامنے سے کریم بھائی کو آتے ہوئے دیکھا۔ بے اختیار میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا......اللہ خیر کرے! کریم بھائی صبح ہی صبح......!

نزدیک آنے پر اس نے مجھے سلام کیا اور جوش بھرے لہجے میں بولا۔

”وکیل صاحب! کمال ہو گیا۔ آپ کی پیش گوئی بالکل درست ثابت ہوئی ہے۔ نینی نے فیصل کو بہت مایوس کیا ہے۔ ان کے درمیان دس پندرہ منٹ تک ٹیلی فونک تکرار ہوتی رہی، پھر فیصل نے جھنجلا کر ریسیور، کریڈل پر پٹخ دیا اور بڑبڑاتے ہوئے بولا...... پتہ نہیں...... نینی کو کیا ہو گیا ہے۔ میری بات اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہی۔“

”اس نے ریسیور رکھنے کے بعد آپ سے کیا کہا؟“ کریم بھائی کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

”وہ خاصا اُلجھا ہوا اور مایوس دکھائی دیتا تھا۔“ کریم بھائی نے جواب دیا۔ ”مجھ سے زیادہ بات تو نہیں کی، صرف اتنا کہا کہ وہ کل صبح دفتر پہنچ کر نینی سے تفصیلی بات کرے گا۔ نینی نے بھی اس سے یہی کہا ہے کہ کل آفس میں اس موضوع پر بات کریں گے۔“

”کریم بھائی! آپ یہ جنگ جیت چکے ہیں۔“ میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”آئیں میرے ساتھ۔“ میں نے بہ آہستگی عدالت کی جانب قدم بڑھا

دیئے۔

وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

''مجھے یقین نہیں آ رہا، وکیل صاحب! کہ میں اتنی آسانی سے بازی جیت چکا ہوں۔''

''بعض کامیابیاں ایسی ہوتی ہیں کہ آنکھوں دیکھ کر اور کانوں سن کر بھی یقین نہیں آتا، کریم بھائی!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''فیصل کی واپسی بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔''

وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''وکیل صاحب! آج آفس میں، نینی کوئی نیا داؤ تو نہیں مار دے گی؟........ اس مکار لومڑی سے کچھ بھی بعید نہیں........ یہ نہ ہو کہ ہماری ساری محنت پر پانی پھر جائے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا، کریم بھائی!'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ کو جس لومڑی کے شر کا ڈر ہے، وہ تو دُم دبا کر جنگل کی طرف نکل گئی ہوگی۔ مجھے نہیں امید کہ وہ آج آفس بھی آئے۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔'' وہ اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کی غیر حاضری سے فیصل کو یقین ہو جائے گا کہ وہ اس کے ساتھ سنجیدہ نہیں تھی، پیار محبت کا ڈھونگ ایک ٹھٹھے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔''

''ہاں، آپ بالکل درست انداز میں سوچ رہے ہیں، کریم بھائی!'' میں نے عدالت نے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے تائیدی انداز میں کہا۔ ''اور اگر نینی دفتر سے غائب نہیں ہوتی اور کسی چال بازی سے فیصل کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتی ہے تو لنچ تک اس کی یہ کوشش بھی ناکام ہو جائے گی۔''

''اچھا........!'' کریم بھائی نے چونک کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''لگتا ہے، آپ نے اپنے طور پر بھی کوئی بندوبست کیا ہوا ہے۔''

''بڑا تگڑا اور مضبوط بندوبست۔'' میں نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''نینی آج آفس آئے یا نہ آئے، ہر دو صورت میں لنچ تک فیصل کے دل میں اس کے لئے نفرت نہ سہی، لیکن بیزاری اور ناپسندیدگی ضرور پیدا ہو جائے گی۔''

''آپ نے ایسا کیا کر دیا ہے، وکیل صاحب؟'' وہ متذبذب نظروں سے مجھے

دیکھنے لگا۔

میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''میں نے فیصل کے آفس ایڈریس پر ایک ایٹم بم روانہ کیا ہے، جو لنچ سے پہلے اس کے ہاتھوں میں ہوگا اور پن کھینچتے ہی یعنی سیل کھولتے ہی اتنا زوردار دھماکا ہوگا کہ اس کی دماغ کی چولیں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں گی۔''

''آپ بڑی خطرناک باتیں کر رہے ہیں، وکیل صاحب!'' وہ سراسیمہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ جو کچھ کرنے جا رہے ہیں... بلکہ آپ کی ہنرمندی سے جو کچھ ہونے جا رہا ہے، اس سے میرے فیصل کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا نا؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے قطعیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ مطمئن ہو کر گھر جائیں۔ جب رات کو آپ کی فیصل سے ملاقات ہوگی تو وہ بہت ہی بدلا بدلا، بہت ہی سدھرا سدھرا سا دکھائی دے گا۔ آپ بے ساختہ اور وارفتہ اسے گلے سے لگا لیں گے، آپ کو اپنا فیصل مل جائے گا........ نینی سے، ملاقات سے پہلے والا فیصل!''

وہ چند لمحوں تک عقیدت بھری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا، پھر سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

میں نے گزشتہ روز کریم بھائی کے جانے کے بعد، ایک کوریئر کمپنی فون کر کے ان کے نمائندے کو اپنے دفتر بلایا تھا۔ میں نے ایک خاص نوعیت کا پھڑکتا ہوا نوٹس پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ کوریئر کمپنی کا نمائندہ میرے پاس آیا تو میں نے مذکورہ لفافہ اس کے حوالے کر کے ارجنٹ ترسیل کی ہدایت کر دی۔ اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ آئندہ روز یعنی آج دوپہر تک میرا بھیجا ہوا لیٹر متعلقہ شخص تک پہنچ جائے گا۔ میں مطمئن ہو گیا تھا۔

ایم اے بیگ نامی ''ایک ایڈووکیٹ'' نے وہ نوٹس کسی فیصل کریم کے نام ارسال کیا تھا، جو کسی نینی نامی لڑکی کی فریبی محبت میں اُلجھا ہوا تھا!

●......●......●

میرا خیال تھا، کریم آئندہ روز کسی وقت مجھ سے ملنے آئے گا اور اس نوٹس کے حوالے سے، مجھ سے درجنوں سوال کرے گا۔ میں نے اس بارے میں پہلے ہی سے

سوچ رکھا تھا۔ کریم بھائی کو مطمئن کرنا میرے لئے چٹکیوں کا کھیل تھا۔ لیکن میرا خیال درست ثابت نہیں ہوا۔

میں رات کے کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ کریم بھائی کا فون آ گیا۔ اس وقت میں اپنے گھر ہی میں تھا۔ میں نے کریم بھائی کو دفتر اور گھر دونوں جگہوں کے نمبرز دے رکھے تھے۔ میں نے ماؤتھ پیس میں ''ہیلو'' کہا تو دوسری جانب کریم بھائی کی سرسراتی ہوئی آواز اُبھری۔

''وکیل صاحب! میں کریم بھائی بول رہا ہوں۔ السلام علیکم......!''

''وعلیکم السلام!'' میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد پوچھا۔ ''سب خیریت تو ہے نا، کریم بھائی؟ اس وقت فون......؟''

''میں آپ کے سوالات کے جوابات بعد میں دوں گا، جناب!'' وہ دبی دبی آواز میں بولا۔ ''پہلے آپ مجھے یہ بتائیں کہ کیا آپ غیب داں ہیں؟''

''استغفراللہ!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''کریم بھائی! آپ مجھے گناہ گار نہ کریں۔ غیب داں صرف خدا کی ذات ہے۔''

''تو پھر آپ کو نجوم کا علم آتا ہے......!'' وہ بہ دستور محتاط لہجے میں بولا۔

اس کی آواز اور لہجے کے اُتار چڑھاؤ سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اس لئے اتنا محتاط ہے کہ کوئی اس کی آواز نہ سن لے۔ وہ اس وقت اپنے گھر کے نمبر سے بات کر رہا تھا، جہاں صرف تین افراد رہتے تھے۔ نورین، فیصل اور خود کریم بھائی۔ نورین کا قیام بالائی منزل پر تھا، لہٰذا اس کی جانب سے کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا واضح طور پر یہی مطلب ہو سکتا تھا کہ وہ فیصل کی طرف سے محتاط تھا۔

میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

''میں نجومی بھی نہیں ہوں، کریم بھائی! آپ پہیلیاں نہ بوجھوائیں اور یہ بتائیں کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟''

''آپ نجومی نہیں ہیں، لیکن آپ کی یہ پیش گوئی پوری ہو گئی کہ آج نینی آفس نہیں آئے گی۔'' وہ اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولا۔ ''فیصل نے فون پر اس سے رابطہ کرنے

کی کوشش کی، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر اسے ایک نوٹس موصول ہوا، جو کسی شکیل نامی کسی شخص نے اپنے وکیل ایم اے بیگ کے توسط سے اسے بھجوایا ہے۔ میں جانتا ہوں، ایم اے بیگ یعنی مرزا امجد بیگ آپ ہیں اور شکیل وہ بندہ ہے، جس کے بارے میں آپ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نینی کا منگیتر ہے۔ فیصل نے یہ نوٹس مجھے دکھایا، وہ سخت پریشان ہے۔ تھوڑا بہت پریشان تو میں بھی ہوں، لیکن......'' وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''بہرحال، میں نے فیصل کو تسلی دی ہے اور اس سے کہا ہے کہ ایک تجربہ کار وکیل سے میری دوستی ہے۔ ہم جا کر اس سے مشورہ کرتے ہیں۔ فیصل گاڑی نکالنے کے لئے گیا ہے۔ ہم ابھی اور اسی وقت آپ کے گھر آ رہے ہیں۔ باقی معاملات آپ کو سنبھالنا ہوں گے۔''

''میں عموماً گھر پر کلائنٹس سے ملاقات نہیں کرتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کریم بھائی! آپ کا کیس چونکہ منفرد نوعیت کا ہے، اس لئے آپ بے دھڑک مجھ سے ملنے آ سکتے ہیں۔ لگتا ہے، اس کیس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کا وقت آ گیا ہے۔''

میں پُرسوچ انداز میں متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو میرا گھر ڈھونڈنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہو گی؟''

''بالکل نہیں، وکیل صاحب!'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے، تو میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''ایک بات ذہن میں رکھئے گا۔'' وہ محتاط لہجے میں بولا۔

''کون سی بات؟'' میں نے پوچھا۔

''نوٹس بیگ صاحب کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اسی لئے فیصل کو لے کر آپ کے دفتر نہیں آیا کہ ہمارا راز نہ کھل جائے۔ آپ کو یہ ظاہر نہیں ہونے دینا کہ آپ ہی ایم اے بیگ ہیں!''

''بے فکر ہو جائیں، کریم بھائی!'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ فیصل کے سامنے مجھے ''وکیل صاحب، امجد صاحب اور مرزا صاحب'' وغیرہ کہہ کر مخاطب

کیجئے گا۔ اس طرح بات نبھ جائے گی۔"

"اور آپ کی رہائش گاہ کے باہر جو نیم پلیٹ آویزاں ہے۔" اس نے ایک ٹیکنیکل نکتہ اٹھایا۔ "اس پلیٹ پر کہیں ایم اے بیگ تو نہیں لکھا ہوا؟"

"نہیں۔" میں نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ "میرے گھر والی نیم پلیٹ پر "مرزا ہاؤس" لکھا ہوا ہے۔"

اس نے ایک سکون بھری سانس خارج کی اور ریسیور رکھ دیا۔

●……●……●

وہ دونوں میرے سامنے بیٹھے تھے۔

کریم بھائی بے حد پریشان نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا، جبکہ فیصل کے چہرے سے ندامت نما خجالت جھلکتی تھی۔

کریم نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں مجھے صورتِ حال سے آگاہ کیا، جس میں فیصل کو معصوم اور سیدھا سادہ لڑکا ثابت کرتے ہوئے نینی کو چال باز لڑکی کے روپ میں پیش کیا گیا تھا۔ آخر میں وہ نوٹس والا لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

"مرزا صاحب! میں نے ساری سچائی آپ کو بتا دی ہے۔ اس معاملے میں میرے بیٹے فیصل کا کوئی قصور نہیں۔ قصور اگر ہے تو اس آوارہ لڑکی نینی کا ہے، جو منگنی شدہ ہونے کے باوجود بھی میرے بیٹے سے پیار کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ ویسے میں سمجھتا ہوں، نینی کے منگیتر نے بالکل صحیح قدم اٹھایا ہے۔ ایک غیرت مند مرد یہی کر سکتا ہے۔ اس قسم کے معاملات زیادہ عرصے تک چھپے نہیں رہتے۔ یقیناً شکیل کو بھی کہیں نہ کہیں سے ان کے تعلقات کی بھنک مل گئی ہوگی۔ پھر ہو سکتا ہے، اس نے خود بھی نینی کی نگرانی کی ہو۔"

وہ سانس لینے کو متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"آپ اس نوٹس کو پڑھیں گے تو صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔"

ان لمحوں میں کریم بھائی بڑی ستھری ایکٹنگ کر رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے داد دی اور اس نوٹس کو پڑھنے کی اداکاری کرنے لگا، جو خود میرا ہی بھیجا ہوا تھا۔

اس نوٹس کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔

شکیل نامی ایک شخص نے اپنے وکیل ایم اے بیگ کے توسط سے فیصل کو دھمکانے کی کوشش کی تھی کہ وہ نینی اور فیصل کے بیچ پروان چڑھنے والے معاملات سے آگاہ ہو چکا ہے، لہٰذا وہ اسے تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اس کی منگیتر سے دور رہے۔ اور عرصہ دس یوم میں وہ کسی وکیل ہی کے توسط سے پکے کاغذ پر اس نوٹس کا جواب دے، جس میں اس بات کی یقین دہانی کرائی گئی ہو کہ وہ آئندہ کبھی نینی سے ملے گا اور نہ ہی اس کے قریب آئے گا۔ نینی کو کنٹرول کرنے کا شکیل نے خود ذمہ لے لیا تھا۔

نوٹس کی آخری سطور میں بڑے واشگاف الفاظ میں کہا گیا تھا کہ اگر فیصل ان غیر اخلاقی اور غیر قانونی حرکتوں سے باز نہ آیا تو شکیل اپنے والدین کو لے کر نینی کے گھر پہنچے گا اور نینی کے والدین کے ہمراہ یہ قافلہ فیصل کے گھر آئے گا اور وہاں اتنا ہنگامہ ہو گا کہ محلے والوں کو پتہ چل جائے گا کہ فیصل کس قماش کا لڑکا ہے......وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اس نوٹس کو میز پر ڈال دیا اور کریم بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سچویشن خاصی گمبھیر بلکہ سنگین ہے۔ ایک بات پوچھوں، اس کا بالکل درست جواب دیجئے گا۔"

"امجد صاحب! آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں، پوچھیں۔" کریم بھائی بے تابی سے بولا۔ "میں بھلا آپ سے کیوں غلط بیانی کروں گا؟ میں نے سن رکھا ہے، اگر نتائج کی چاہت ہو تو دائی سے پیٹ، ڈاکٹر سے مرض اور وکیل سے حقائق نہیں چھپانا چاہئیں۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک سن رکھا ہے، کریم بھائی!" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ پھر پوچھا۔ "اس نوٹس میں نینی اور فیصل کے جن روابط کی بات کی گئی ہے، اس میں کس حد تک حقیقت ہے؟"

"فیصل سے یہ نادانی ہوئی ہے، مرزا صاحب! شکیل کا دعویٰ غلط نہیں۔" کریم بھائی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اور یہ اپنی غلطی پر نادم بھی ہے۔"

"آپ نے تو مجھے بتایا تھا کہ فیصل کی، ایک معزز خاندان میں منگنی کر دی گئی ہے۔" میں نے طنزیہ نظروں سے فیصل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کے باوجود بھی......؟"

"امجد انکل! میں آپ کو بتاتا ہوں۔" میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا

تو فیصل مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔
''ڈیڈی نے مجھے نینی اور اس کے گرو عبدالصمد کے بارے میں سب کچھ تفصیلاً بتا دیا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ نینی میرے ساتھ کھلواڑ کر رہی تھی۔ اسے مجھ سے کبھی محبت تھی ہی نہیں۔ وہ ڈیڈی کو نقصان پہنچانے کے لئے محض عبدالصمد کے اشاروں پر ناچ رہی تھی۔ اور میں اس کے جال میں آ گیا۔''
وہ سانس لینے کو متوقف ہوا، پھر جذباتی لہجے میں بولا۔
''مجھے بڑی شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہوا ہے اور میں اپنے کیے پر شرمندہ بھی ہوں۔ میں نے ڈیڈی سے وعدہ کیا ہے کہ ہمیشہ کے لئے نینی کو اپنے دل و دماغ سے کھرچ کر پھینک دوں گا، بلکہ میں تو اب اس سے شدید نفرت کرنے لگا ہوں۔''
''مجھے فیصل پر اور اس کے وعدے پر کامل بھروسہ ہے، مرزا صاحب!'' کریم بھائی نے مخصوص قسم کی اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امید ہے، یہ کبھی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔''
''کیوں بھئی فیصل؟'' میں نے فیصل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اپنے ڈیڈی کو آئندہ ایسی کسی مصیبت میں تو نہیں ڈالو گے؟''
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جناب!'' وہ تیقن سے بولا۔ ''یہ پہلا اور آخری موقع تھا۔''
''شاباش!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''یہ میں اس لئے بھی پوچھ رہا ہوں کہ اس نوٹس کا جواب میرے توسط سے جائے گا اور ایک طرح سے میں تمہارا ضامن بھی ہوں گا۔ تم مجھے معافی نامے کا گواہ بھی سمجھ سکتے ہو۔''
میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''دراصل، میں ایم اے بیگ صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ عموماً کریمنل کیس لیتے ہیں۔ دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ جرائم پیشہ افراد ان کی طرف رجوع کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مجھے تو نینی کا منگیتر شکیل بھی خاصا ٹیڑھا بندہ لگتا ہے۔ تم ان لوگوں سے دور ہی رہو تو اچھا ہے۔''

''آپ بالکل مطمئن ہو کر نوٹس کا جواب دیں، مرزا صاحب!'' کریم بھائی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''ہماری وجہ سے آپ کو کبھی شکایت نہیں ہو گی۔''
میں نے ''ایم اے بیگ اور شکیل'' کے حوالے سے جو بھی خطرناک باتیں کی تھیں، وہ محض فیصل کو ڈرانے کے لئے تھیں تاکہ آئندہ کے لئے اس کے پایۂ استقامت میں کوئی لغزش نہ آنے پائے۔ وہ اس کھیل کا مرکزی کردار تھا۔ اگر وہ مضبوط ہو جاتا تو پھر کریم بھائی کے لئے کسی ڈر، خوف یا پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں یہ سب کچھ ایک نیک مقصد کے لئے کر رہا تھا۔ اسی لئے قدرت بھی میرا ساتھ دے رہی تھی۔
میں نے اپنی میز کی دراز میں سے ایک اسٹامپ پیپر اور چند سادہ کاغذات نکال کر مختلف مقامات پر فیصل کے دستخط لئے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
''کریم بھائی! مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ اس معمولی سے کام کے لئے میں کل آپ لوگوں کو اپنے دفتر بلاتا۔ مختلف نوعیت کے قانونی کاغذات میرے گھر پر بھی رکھے رہتے ہیں۔ آپ کے دستخط ہو گئے، میں کل خود ہی نوٹس کا جواب ٹائپ کروا کے اپنی وکالت کے ساتھ ایم اے بیگ کو بھجوا دوں گا۔ آپ لوگ مطمئن ہو کر اپنے گھر جائیں۔''
''بہت بہت شکریہ، مرزا صاحب!'' کریم بھائی نے کہا۔
فیصل احسان مندی کے جذبات کے ساتھ بولا۔
''امجد انکل! آپ نے گھر بیٹھے بیٹھے ہمارا مسئلہ حل کر دیا ہے، اس کے لئے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔''
میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
''نوجوان! اپنے والدین کا خاص خیال رکھو، خاص طور پر اپنی بیمار ماں کا........ انہیں کوئی دکھ یا تکلیف نہ پہنچنے دو........ اگر تم ایسا کرتے رہو گے تو میں سمجھوں گا، تم نے بڑے اچھے الفاظ اور بڑے احسن انداز میں میرا شکریہ ادا کر دیا۔''
لگ بھگ رات گیارہ بجے وہ میرے گھر سے رخصت ہو گئے۔

●......●......●

آئندہ روز میں عدالتی بکھیڑوں سے فارغ ہو کر دفتر پہنچا تو کریم میرا منتظر تھا۔
میں نے فوراً اسے اپنے چیمبر میں بلا لیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس

سے پوچھا۔

”کریم بھائی! لگتا ہے، آج کل آپ نے پلازا کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ کاروبار پر آپ کی توجہ نہیں رہی۔“

”کل سے باقاعدہ دکانوں پر جاؤں گا۔“ وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”کل رات ہی کو تو روزے پورے ہوئے ہیں، آج میری عید ہے۔ پچھلے ایک ماہ سے میں کڑی آزمائش میں تھا۔ آپ کی راہ نمائی اور مدد سے میں سرخرو ہوا ہوں۔“

”آپ کا کام ہو گیا، میرے لئے یہ خوشی کی بات ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا، پھر پوچھا۔ ”فیصل کا کیا حال ہے؟“

”ایک دم تیر کے مانند سیدھا ہو گیا ہے۔“ وہ پُرمسرت لہجے میں بولا۔

”اور نینی کی کوئی خیر خبر......؟“

”وہ آج بھی دفتر نہیں گئی۔“ کریم بھائی نے بتایا۔ ”لگتا ہے، اب وہ اس مالیاتی ادارے کا رخ نہیں کرے گی۔“

”ہاں......اصولی طور پر ہونا تو یہی چاہیئے۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آج میں نے اس کے عزائم کے تابوت میں بھی آخری کیل ٹھونک دی ہے۔“

کریم بھائی نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔

”کیا مطلب، وکیل صاحب؟“

”میں نے آج صبح شکیل کے پارٹی ڈیکوریشن والے ایڈریس پر ایک خط پوسٹ کیا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ خط ایک ایسے فرضی نامعلوم، ہمدرد اور خیرخواہ شخص کی جانب سے ہے، جو عبدالصمد کے ملازمین میں شامل ہے، لیکن خود کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ البتہ، وہ بندہ نینی اور عبدالصمد کے معاملات اور نینی اور فیصل کے تعلقات سے بہ خوبی آگاہ ہے......“

”اس خط میں لکھا کیا گیا ہے......؟“ میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا تو کریم بھائی نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔ ”آپ بھی ایک سے بڑھ کر ایک چال چل رہے ہیں۔“

میں نے جواب دیا۔

”اس خط میں شکیل سے دلی ہمدردی رکھنے والے شخص نے نینی اور فیصل کا حوالہ دیتے ہوئے شکیل کو بتایا ہے کہ وہ ہوشیار ہو جائے۔ ورنہ یہ نہ ہو کہ اس کے ہونے والے باغ کی کوئی غیر باغبان آبیاری کرتے ہوئے نئے سے نئے گُل کھلاتا چلا جائے۔“

”اوہ......یہ تو آپ نے زبردست کام کیا ہے، وکیل صاحب!“ کریم بھائی نے تعریفی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ”اب شکیل اپنی ہونے والی بیوی کو خود ہی نکیل ڈال لے گا، میرا فیصل ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا ہے۔“

”شکیل تو نینی کو نکیل ڈالے گا یا نہیں، لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اس نیک کام میں تاخیر نہ کریں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

کریم بھائی نے اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے وضاحتی لہجے میں کہا۔ ”اب آپ پہلی فرصت میں فیصل کو نکیل ڈالنے کا بندوبست کر لیں۔ میرے خیال میں، اس کی شادی میں دیر نہیں ہونی چاہیئے۔“

”آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر، وکیل صاحب!“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

”آپ تو میرے اور میری فیملی کے لئے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئے ہیں۔ اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر دے گا۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں نے کبھی حاجی، نمازی اور پرہیزگار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن یہ ہے کہ میں حتیٰ الامکان کوشش کرتا ہوں کہ دوسروں کے کام آ سکوں۔“

”اوہ، میں ایک بات تو بھول ہی گیا۔“ کریم جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”اللہ تو آپ کو اس نیک کا کام جو اجر دے گا، وہ اس کا معاملہ ہے لیکن مجھے بھی تو آپ کا کچھ قرض ادا کرنا ہے۔“

”قرض......؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے کریم بھائی کی طرف دیکھا۔

وہ اپنی جیب میں سے بھورے رنگ کا ایک پھولا ہوا لفافہ برآمد کرتے ہوئے بولا۔

”جی ہاں، قرض...... یہ رکھ لیں جناب!“ اس نے مذکورہ لفافہ میری جانب

بڑھا دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''آپ کی فیس۔'' کریم زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔

میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ لفافہ تھام لیا۔ یہ بھی ایک غیر روایتی اقدام تھا۔ میرا یہ اصول رہا ہے کہ میں اپنی فیس ایڈوانس لیا کرتا ہوں اور اس کیس میں یہ کام سب سے آخر میں ہوا تھا۔

ویسے اگر باریک بینی سے نگاہ ڈالی جائے تو اس کیس میں ابتدا سے انتہا تک سب کچھ معمول سے ہٹ کر اور جدا جدا ہوا تھا، صرف ایک فیس پر ہی موقوف نہیں تھا۔

کریم بھائی نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''وکیل صاحب! میں نے کوشش کی ہے کہ آپ کی حق تلفی نہ ہو۔ لیکن اگر پھر بھی آپ یہ محسوس کریں کہ فیس کی رقم میں کوئی کمی ہے تو آپ ایک بے تکلف دوست کی طرح مجھے بتا سکتے ہیں۔''

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''کریم بھائی! آپ اور آپ کی بیوی میری نظر میں ایک مثالی جوڑا ہیں........ جو لوگ گود لئے ہوئے بچے کو اپنی سگی اولاد سے کہیں بڑھ کر چاہتے ہوں، وہ کسی کی حق تلفی کیسے کر سکتے ہیں؟........ آپ نے لفافے میں رکھ کر مجھے جو کچھ بھی دیا ہے، وہ مجھے قبول ہے۔''

وہ مجھ سے گرم جوش مصافحہ کرنے کے بعد رخصت ہو گیا۔

بعد ازاں، میں نے کریم بھائی کے دیئے ہوئے براؤن لفافے کو جب کھولا تو مجھے اپنے فیصلے پر کوئی افسوس نہیں ہوا۔ میں نے ان کے لئے بالکل مناسب ٹائٹل کا انتخاب کیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک ''مثالی جوڑا'' تھے۔

پھولے ہوئے لفافے میں سے جو رقم برآمد ہوئی، وہ میری فیس سے تقریباً دُگنی تھی۔ میں مسکرائے بنا نہ رہ سکا........!

(تمت بالخیر)